بوٹم

مجموعۂ کلام

سیّد انور علی انورؔ

وَطَرَحَ بِهِ

حمد و نعت

حمد

اپنے ہنگاموں سے دُنیا خود بھی اُکتا جائے گی
ایک دن قدموں میں تیرے سر کے بل آجائے گی

تجھ سے جو سرکش ہوا اُس کا ٹھکانہ پھر کہاں
کشتی وہ ڈوبے گی جو ساحل سے ٹکرا جائے گی

تیری شانِ بے نیازی کو سمجھ لینے کے بعد
لذّتِ عزمِ خطا خود آپ شرما جائے گی

کثرت دُنیا کا مرکز تیری وحدت ہی تو ہے
لوٹ کر دُنیا اِسی مرکز پہ پھر آجائے گی

تجھ سے آگے سوچنے والے سمجھتے ہی نہیں
بڑھ کے دریا سے کہاں اِک موجِ دریا جائے گی

درد حد سے بڑھ کے انور خود سکوں بن جائیگا
رات جب گذرے گی حد سے پھر سحر آجائے گی

دُعا

یارب جو دے تو عشقِ رسالتمآبؐ دے
ذوقِ نظر نہ چاہتِ حسن و شباب دے

عشقِ جمالِ عارض و گیسو سے فائدہ؟
فکرِ مآلِ پُرسشِ یومُ الحساب دے

محتاج اب نہ اور کسی کا بنا مگر
اُس صاحبِؐ کرم کی گدائی شتاب دے

اُمّت تمام قعرِ مذلّت میں گر چکی،
اے دستِ غیب بڑھ کے سہارا شتاب دے

تقلیدِ اہلِ شرک تجھے کیوں ہوئی پسند
اے اُمّتِ رسولؐ خدارا جواب دے

انور نہ اب بھی آنکھ کھُلی آپ کی اگر،
ممکن ہے اب نہ وقت عدو وقتِ خواب دے

نعت شریف

حبیبؐ خالقِ کون و مکاں خیر البشر آیا
جہانِ آب و گل میں دو جہاں کا تاجور آیا

فلک سے آمنہؓ کے گھر میں وہ رشکِ قمر آیا
کہ جس کی روشنی سے چہرۂ ہستی نکھر آیا

مٹانے ظلمتِ باطل کو خورشیدِ سحر آیا
بچھانے نور کی چادر وہ رشکِ صد قمر آیا

وہ آیا جس کو فخرِ انبیائے ماسبق کہیئے
وہ ختم المرسلیںؐ وہ بادشاہِ بحر و بر آیا

خدا کے نور کا پیکر خدا کی ذات کا مظہر
خدائی جس پہ صدقہ تھی جہاں میں وہ بشر آیا

ہوا ہے جس پہ نازل مصحفِ اعلےٰ زمانے میں
گیا ہے جو شبِ اسرا میں عرشِ پاک پر آیا

مٹائی جس نے اس دنیا سے آ کر کفر کی ظلمت
اندھیری رات میں وہ چاند بدلی سے ابھر آیا

نعت شریف

جس طرف دیکھئے اِک عالمِ رعنائی ہے
آج رحمت کی مدینے پہ گھٹا چھائی ہے
آپؐ محبوبِ خدا ہیں آپکی خاطر واللہ
کیا کیا تخلیق نہ اللہ نے فرمائی ہے
خود تو فاقے سے رہے غیر کی جھولی بھر دی
آپؐ نے حق سے عجب شانِ عطا پائی ہے
آپؐ سے بڑھ کے ہوا، اور نہ ہوگا کوئی،
آپؐ نے ختمِ نبوّت کی سند پائی ہے
آپؐ پائیں گے وہاں پر بھی مقامِ محمود
آپؐ نے عظمتِ معراج یہاں پائی ہے
آپؐ کو چھوڑ کے اللہ کو پائے انساں
ذہنِ باطل کی فقط حاشیہ آرائی ہے
چلئے اَب چلئے مدینہ کہ وہاں کی انورؔ،
بڑھ کے راحت سے تمہیں آبلہ پائی ہے

نعت شریف

دل ہوا ہجر سے بیزار، مدینہ والے
اب بلا لو مرے سرکارؐ، مدینہ والے

جو نہ الفت میں کٹے آپ کی میرے آقاؐ
زندگی ہے وہی بے کار، مدینہ والے

ایک مدت سے ترستی ہوئی آنکھوں کیلئے
ہو عطا عشرتِ دیدار، مدینہ والے

دل کو دنیا کی طلب ہے نہ ہوس ہے زر کی
بس ایک نظر کا ہوں طلبگار مدینے والے

اب تو ہم پر بھی عنایت کی نظر ہو آقاؐ
ہم بھی ہیں طالبِ دیدار، مدینہ والے

ہے ہمیشہ کیلئے آپؐ کی قربت حاصل
کتنے خوش بخت ہیں انصار، مدینہ والے

فکر کیا ہم کو شفاعت کو ہماری انورؔ
ہیں شفیع احمدِ مختارؐ، مدینہ والے

نعت شریف

مشعلِ وحدت لئے با آب و تاب آ ہی گیا
رخصت اے باطل کی ظلمت آفتاب آ ہی گیا

نازشِ پیغمبراں فخرِ سلیمانؑ و خلیلؑ
رحمت حق شافع یوم الحساب آ ہی گیا

صبح نورانی سہانا وقت شبنم گل فشاں
مژدہ اے اہلِ چمن رحمت مآب آ ہی گیا

جگمگا اٹھا جہاں لرزاں ہوا ایوانِ کفر
ہستیٔ انساں میں آخر انقلاب آ ہی گیا

ہے ثناخواں جس کا اکثر خود خدائے دوجہاں
ھادی دیں صاحبِ اُمّ الکتاب آ ہی گیا

آ گیا شمعِ شبستانِ حریمِ لم یزل
حشر تک چمکے گا جو وہ آفتاب آ ہی گیا

بڑھ کے انور ہار گلہائے سخن کا ڈال دو
سامنے قسمت سے رشک مہتاب آ ہی گیا

غزلیات

(۱)

دل تری زُلف کا شیدائی تھا
بس یہی باعثِ رسوائی تھا

میں ہی کیا بزمِ جہاں میں یارو
اُس کا ہر ایک تمنّائی تھا

تم ہی آئے تھے چمن میں ورنہ
کس کا ہر پھول تماشائی تھا

کچھ نہیں یاد کہ کیا تھی ظالم
وہ ادا جس کا میں سودائی تھا

کچھ ہمیں کور نظر تھے انور
جلوہ سرگرمِ پذیرائی تھا

(۲)

جان و دل کے لئے قاتل پایا
عشق آساں نہیں مشکل پایا

بزمِ عشاق کا عالم تھا عجیب
خوش تھا جتنا جسے بسمل پایا

تشنہ لب تھے وہی میکش ساقی
جن کو میخانے کا حاصل پایا

اشک جو آنکھ سے ٹپکا اکثر
خونِ دل اُس میں بھی شامل پایا

حُسن و دولت کہ محبت بخشی
جس کو جس چیز کے قابل پایا

ہم نے خوبانِ جہاں میں انور
جس کو دیکھا اُسے قاتل پایا

(۴۳)

اِک بُتِ کافر کا دیوانہ ہُوا
دل مرا بارِ و صنم خانہ ہُوا

سب نے اُن آنکھوں سے پائی ہے کشش
گُل ہُوا وہ یا کہ پیمانہ ہُوا

اک دنا دشمن سے چاہا التفات
بس اِسی کا بڑھ کے افسانہ ہُوا

کام جب کوئی نہ اپنے آسکا
کیا ہوا اپنا کہ بیگانہ ہُوا

شمع کب خود عشق میں تنہا جلی
جب جلی یہ ساتھ پروانہ ہُوا

بات میں انور بتوں کی آگیا
خاک یہ انسان فرزانہ ہُوا

(۴)

کیا دل کی بات کریں انور جب دل ہی اپنا ٹوٹ گیا
دل جس کے سہارے زندہ تھا وہ ساتھی ہم سے چھوٹ گیا

اک آس تھی جس پر ضبط کیا طوفان جو غم کا دل میں اُٹھا
وہ وقت بھی لیکن آ ہی گیا جب آس کا دامن چھوٹ گیا

کچھ فکر سے اپنی بن نہ سکا سب عزم و عمل بیکار رہے
اک رہزنِ راہِ عشق ملا اور صبر کی دولت لوٹ گیا

انجام یہی ہے ہستی کا کیا موت اِسی کو کہتے ہیں ؟
بیمار کی آنکھیں پتھرائیں اور تارِ نفس کا ٹوٹ گیا

اب منزلِ ہستی کا انور انجام نہ جانے کیا ہوگا
اک دوست کہ تھا ہمراہِ سفر کچھ دور چلا اور چھوٹ گیا

(۵)

غم ترا آخر زباں تک آ گیا
رازِ دل حرف و بیاں تک آ گیا

لاکھ ٹھوکا پھر بھی دیوانہ ترا
آج تیرے آستاں تک آ گیا

عقل کے ہاتھوں یقیں کے باوجود
ذہنِ انسانی گماں تک آ گیا

کہہ گئی دل سے نگاہِ یار کچھ
راز یعنی رازداں تک آ گیا

بن گئی آخر خموشی ہی زباں
ضبطِ اظہارِ فغاں تک آ گیا

باغباں جاگا مگر صیّاد جب
بڑھ کے میرے آشیاں تک آ گیا

زد میں بجلی کی نشیمن ہی نہیں
سیلِ آفت گلستاں تک آ گیا

پیشِ باطل بھی ہے انورؔ سجدہ ریز
آہ یہ انساں کہاں تک آ گیا

(٦)

دل کو غمِ فراق کا خوگر بنا دیا
ہر تلخیِ حیات کو خوش تر بنا دیا

مژگاں کو دی وہ نوک کہ نشتر بنا دیا
ابرو کو یوں جھکایا کہ خنجر بنا دیا

دے کر سکون ذرّہ کو کہسار کر دیا
قطرے کو جوش دے کے سمندر بنا دیا

حُسنِ ستم شعار کی دیکھ طلب ہمیں
اک دلنشیں تڑپ کو مقدر بنا دیا

بخشی ہے دلکشی وہ رُخ و زلفِ یار کو
ہر اہلِ دل کے واسطے دلبر بنا دیا

نغمے کو آہ دے کے بنایا ہے عندلیب
پتّوں کو رنگ و بو سے گُلِ تر بنا دیا

مستی سے اُس نگاہ کو تاثیرِ مے ملی
شوخی نے چشمِ یار کو ساغر بنا دیا

(۷)

سب کچھ ہمیں قبول ہے ایمان کے سوا
سب کچھ ہیں ہم بس ایک مسلمان کے سوا

مذہب ہو یا سیاستِ عالم ہمارے پاس
کچھ بھی نہیں ہے فتنہ و طغیان کے سوا

چھایا ہے وہ سکوت کہ اس خواب سے ہمیں،
کوئی جگا سکے گا نہ طوفان کے سوا

انکار وہ بھی اپنے ہی خالق کا برملا
کس نے کیا ہے حضرتِ انسان کے سوا

ہستی ہماری رشتۂ اعمال کے سبب
کچھ بھی نہیں ہے پیکرِ بے جان کے سوا

(۸)

معاملہ لطف کرم کا رکھا
ہم کو ہر حال میں اپنا رکھا

عمر اُمّیدِ وفا میں گذری
عشق نے عقل کا پردا رکھّا

ہم نے اِس کو بھی عنایت جانا
اُس نے محرومِ تماشا رکھّا

زندگانی تھی امانت جس کی،
اُس نے چاہا اُسے جیسا رکھّا

دے دیا ایک نظر کے بدلے
دل کا سودا بڑا سستا رکھّا

دل کی باتوں میں نہ آنا انورؔ
اِس نے ہم کو نہ کہیں کا رکھّا

(۹)

جینا کسی کے ہجر میں دشوار ہو گیا
ہر سانس ہم کو زیست میں تلوار ہو گیا

تم نے تو اک نگاہ کا احسان کر دیا
اور دل کو دیکھئے کہ یہ بیمار ہو گیا

ہنگامِ دید جرأتِ دیدار کب ہوئی
رعبِ جمال مانعِ دیدار ہو گیا

خود اپنے آپ کو بھی نہ پہچان پائے گا
انسان جب بھی خواب سے بیدار ہو گیا

اے جانِ بے قرار مبارک کہ خود ترا
وہ عذرِ امتحاں سے طلب گار ہو گیا

بس اک نگاہِ مست کا اللہ رے اثر
عالم تمام جیسے کہ مے خوار ہو گیا

دیکھو تو اصل اس کی نہیں خاک کے سوا
انسان پھر بھی صاحبِ پندار ہو گیا

تاریک ہو گیا تھا نگاہوں میں آسماں
تم آ گئے تو مطلعِ انوار ہو گیا

قیدِ حیات و موت میں جکڑا ہے بند بند
انور یہاں سے آپ تو مختار ہو گیا

(۱۰)

اپنی اُلفت میں گرفتار کیا
دل پہ ظالم نے عجب وار کیا

اُن کو شوخی نے بنایا دلبر
اُن کو مستی نے ستمگار کیا

اُن کی کیا بات ہے یارو ہم نے
اُن کے غم کو بھی بہت پیار کیا

اُن کی راہوں میں بچھا کر آنکھیں
خود کو اک نقش بہ دیوار کیا

جس طرف بھی وہ نگاہیں اُٹھیں
پتہ پتہ گل و گلزار کیا

اپنی ہی کور نظر نے انورؔ
جلوۂ یار کو دیوار کیا

(۱۱)

نہ کم تھی اگرچہ خطائیں بھی میری
کرم تو مگر بے حساب آپ کا تھا

حسینوں میں تھے یوں تو ماہ و مہر بھی
مگر حُسن تو لاجواب آپ کا تھا

جسے موسمِ گُل سمجھتی تھی دُنیا
حقیقت میں دورِ شباب آپ کا تھا

نگاہوں سے پیتے رہے آپ انورؔ
بہت خوب جامِ شراب آپ کا تھا

(۱۲)

ہر ایک گلی انجانی سی ہر کوچہ ہے بے گانہ سا
اِس دیس میں تیرا چاہنے والا پھر تا ہے دیوانہ سا

اب کون ہے یاں اے دوست بھلا جو آج مجھے پہچانے گا
جب تُو ہی نہیں تو شہر میں تیرے سب کچھ ہے بیگانہ سا

اک تیری رفاقت سے دنیا گلزار تھی اپنی نظروں میں
اک تیرے جُدا ہو جانے سے سنسار ہوا ویرانہ سا،

وہ کیف کی گھڑیاں ختم ہوئیں وہ پیار کے لمحے بیت گئے
اِک دورِ جوانی یاد تو ہے پر بھولا ہوا اَفسانہ سا

پھر بزم میں انور آیا ہے تو کاش اُسے پہچان سکے
باتیں بھی جنوں آمیز سی ہیں انداز بھی ہے رندانہ سا

(۱۳)

کب یار مرا دیوانہ تھا — انداز مگر مستانہ تھا
کچھ ہم پہ عنایت تھی اُنکی — یہ خواب تھا یا افسانہ تھا
تھا حال عجب میخانے کا — جو اپنا تھا بیگانہ تھا
جنبش تھی جوانی چار طرف — میخانہ ہی میخانہ تھا
اے دوست رفاقت میں تیری — پُر نور مرا کاشانہ تھا
محروم نہ تھے ہم دُوری سے — تسکین نظر پیمانہ تھا
کل رات کسی کی محفل میں — ماحول بڑا مستانہ تھا
گلشن میں سحر کا کیا کہنا — پُر کیف کوئی افسانہ تھا
بلوں سے کسی کی یادوں کے — معمور مرا غم خانہ تھا
کب ذوقِ طلب نے ساتھ دیا — ہر ذرہ وہاں خم خانہ تھا

محفل میں جنوں کی اے انور
جو شمع تھی پروانہ تھا

(۱۴)

گلشن میں عجب رنگِ بہاراں دیکھا
ہر پھول بصد چاکِ گریباں دیکھا

جلتے ہی رہے داغ مثالِ انجم
فرقت میں سدا ہم نے چراغاں دیکھا

فریاد پہ اپنی ہی ندامت آئی
جب ہم نے ستمگر کو پشیماں دیکھا

بس ایک تبسّم پہ رہی اپنی نظر
جب بھی زخمِ گلِ خنداں دیکھا

لِللہ بتاؤ تو ہمیں بھی انورؔ
دُنیا میں کہیں آپ نے انساں دیکھا[1]

[1] اس شعر میں کسی انسان یا انسانیت پر طنز نہیں بلکہ ایک فلسفیانہ حقیقت کا اظہار ہے دراصل انسان گوشت پوست کے اس ڈھانچہ کا نام نہیں جو دن رات ہمیں چلتا پھرتا نظر آتا ہے بلکہ اس قوت کا نام ہے جو اس ڈھانچہ کے اندر سے سرگرم عمل رہتی ہے اور نظر نہیں آتی۔

(۱۵)

وہ سامنے تھے پھر بھی زباں تک نہ آسکا
میں اپنے دل کا حال نہ اُن کو سُنا سکا

چھینٹوں سے بے تحاشا ہوا وہ بھی داغدار
قاتل لہو سے میرے نہ دامن بچا سکا

ہے دیکھئے تو گوشۂ دل میں مرے مکیں
وہ حُسن جو نہ کون و مکاں میں سما سکا

ہم ہی نے اختیار عمل کا کیا قبول
یہ بار وہ ہے جو نہ فلک بھی اٹھا سکا

انور ہوئے کچھ ایسے بھی یہاں صاحبان عزم
جن کو ذرا نہ بازوئے باطل دبا سکا

(۱۶)

کیا حرص نے یہ زیست کا نقشہ بنا دیا
انساں کو بے حیائی کا پُتلا بنا دیا

اسلام تھا جو دین سراپا عمل اُسے
کچھ مُفسدوں نے صرف عقیدہ بنا دیا

تعداد کم ہوئی ہے بتوں کی برائے نام
بس بتکدہ ہٹا کے کلیسا بنا دیا

تسکینِ نفس کی یہ نکالی گئی سبیل
مذہب کو صرف ایک طریقہ بنا دیا

(۱۷)

دشمن انسانیت کا آسرا بن جائے گا
کیا خبر تھی یہ زمانہ کیا سے کیا بن جائے گا

بندگانِ ناز زندہ ہیں تو وہ کافر ادا
دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن خدا بن جائے گا

بن گئی محکم ظرفیٔ اخلاق جب معیارِ زیست
کہہ نہیں سکتے کہ پھر انسان کیا بن جائے گا

کر دیا ساقی نے محکم ظرفوں کے میخانہ سپرد
مے پہ کیا گذرے نہ جانے جام کیا بن جائے گا

(۱۷)

دشمن انسانیت کا آسرا بن جائے گا
کیا خبر تھی یہ زمانہ کیا سے کیا بن جائے گا

بندگانِ ناز زندہ ہیں تو وہ کافر ادا
دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن خدا بن جائے گا

بن گئی محکم ظرفیٔ اخلاق جب معیارِ زیست
کہہ نہیں سکتے کہ پھر انسان کیا بن جائے گا

کر دیا ساقی نے محکم ظرفوں کے میخانہ سپرد
مے پہ کیا گذرے نہ جانے جام کیا بن جائے گا

کیسی غیرت اور کیا اخلاق جب ہر بد قماش
پارساؤں کا رئیس و رہنما بن جائے گا

بات رندوں کی الگ اِس دور میں شیخِ حرم
شب کو میکش اور سحر کو پارسا بن جائے گا

بِک رہا ہے آج انورؔ چند سکّوں میں ضمیر
گِر کے اب انسان کیا اِسکے سوا بن جائے گا

(۱۸)

خموشی بڑھ کے بن جائے گی افسانہ تو کیا ہوگا
اگر خود گونج اُٹھا دل کا ویرانہ تو کیا ہوگا

غرورِ حُسن دیوانوں کی کثرت پر بجا لیکن
نہ ہو بالفرض اب کوئی دیوانہ تو کیا ہوگا

چلے تو جائیں اُس کی بزم میں پر غیر کے آگے
وہ ظالم جان کر ہم کو نہ پہچانا تو کیا ہوگا

چمن کی سمت ہی رکھو قفس کو موسمِ گل میں
یہیں سے دیکھ لیں گے ہم وہاں جانا تو کیا ہوگا

چلے تو ہو تلاشِ زندگی میں بڑھ کے رہبر سے
مِلا کعبہ سے پہلے کوئی بُت خانہ تو کیا ہوگا

رہے سوزِ دُروں انور جو دل ہی میں تو اچھا ہے
غزل پڑھتے ہی جل اُٹھا جو میخانہ تو کیا ہوگا

(۱۹)

آپ نے تو اور میرا درد دُونا کر دیا
سامنے آتے ہی دل میں حشر برپا کر دیا

کر نہیں سکتی تھی اظہارِ تمنّا چشمِ شوق
آنسوؤں نے میرے دل کا راز افشا کر دیا

اُن سے کیا شکوہ شکایت کیا کسی سے دوستو
دل کے ارمانوں نے دل میں حشر برپا کر دیا

دیکھنے والے کسی صُورت سُکوں پاتے نہیں
آپ کے جلووں نے دل پر آہ یہ کیا کر دیا

حُسن کی بس ایک متوالی نظر نے وائے شوق
مجھ کو انورؔ بے نیازِ جام و صہبا کر دیا

(۲۰)

پُورا مریضِ عشق کا ارماں نہ ہوسکا
یعنی کسی کی دید کا امکاں نہ ہوسکا

مایوس ہوکے رہ گئے آخر طبیب سب
لیکن کسی سے درد کا درماں نہ ہوسکا

کرتے اظہارِ عشق مگر حُسن کے حضور
ہم سے بیاں ہی قصّۂ ہجراں نہ ہوسکا

مجبوریٔ فراق میں گھبرا کے بارہا
مرنا بھی ہم نے چاہا تو آساں نہ ہوسکا

انورؔ وفائے عشق میں ہم ختم ہوگئے
لیکن وہ شوخ ہم پہ مہرباں نہ ہوسکا

(۲۱)

کون صبحِ عید کو گُل پیرہن یاد آ گیا
مجھ کو فرطِ شوق میں سارا چمن یاد آ گیا

اختلاطِ عیش و غم میں لطف کیا ہے اُس سے پوچھ
عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آ گیا

کروٹیں لیتے ہوئے ہی رات ساری کٹ گئی
شامِ غم میں کوئی کیا رنگیں دہن یاد آ گیا

فرطِ غم سے ہم نشیں بس دل تڑپ کر رہ گیا
جب قفس میں مجھ کو بھولے سے چمن یاد آ گیا

عید کا دن ہے مگر ہو آج افسردہ سے تم
کیا تمہیں انور کوئی غنچہ دہن یاد آ گیا

(۲۲)

آج اُس بُت کو نہ جانے کیا ہوا
غیر کو دیکھا تو بس اُس کا ہُوا

ضوفشاں ہیں صاف کرنیں حُسن کی
بندہ پرور یہ کہاں پردا ہوا

یاں بجُز افسوس انساں کے لئے
کیا مآلِ خواہشِ دُنیا ہوا

حال پُوچھا جب تو آنسو آگئے
رازِ دل کا آج یوں افشا ہوا

کیا بتائیں کیا گذرتی ہجر میں
آگئے تم یہ بہت اچھا ہوا

خوب تر ہیں چاند بھی اور پھول بھی
آپ لیکن وہ جواب اپنا ہوا
ہم کو دیکھا تو ہمارے ہو گئے
یہ تماشا ہے بہت دیکھا ہوا،
بَیر تھا ہم سے ہی شاید آپ کو
ہم جو آئے بزم میں پردا ہوا
کیا شکایت ہو کہ راہِ عشق میں
جو ہوا انورؔ وہ بس اچّھا ہوا

(۲۳)

پرسشِ غم کو وہ حُسنِ بے مثال آیا تو کیا
بعد مرنے کے مرے میرا خیال آیا تو کیا

دل سے رخصت ہو گئی جب آرزوئے انبساط
عید کا پیغام لے کر اب ہلال آیا تو کیا

ہو چکا قصہ کسی کی زیست کا جس دم تمام
تجھ کو اے جانِ اطبّار کچھ کمال آیا تو کیا

مرنے والا واقعی کیا مبتلائے عشق تھا
اُن حسیں ہونٹوں پہ اب بھی سوال آیا تو کیا

سوچتا ہوں میں کہ اُس کا فراد اکے سامنے
ذکرِ غم آیا تو کیا حرفِ ملال آیا تو کیا

ہو گئے قربان لاکھوں بندگانِ چشمِ ناز
کج کُلاہی پر کسی کی پھر زوال آیا تو کیا

اَب کسے احساس ہے انورؔ وصال و ہجر کا
ہجر میں گذری تو کیا دورِ وصال آیا تو کیا

(۲۴)

دُنیا میں اگر عشق کا آزار نہ ہوتا
ہوتا بھی حُسن ستم گار نہ ہوتا

خود دل میں اگر جذبۂ ایثار نہ ہوتا
دل ہوتا مگر کوئی بھی دلدار نہ ہوتا

کچھ کام نہ آتی یہ تری مست ادائی
گر دل ہی محبت کا سزاوار نہ ہوتا

پھر جھوم کے گیسو کی گھٹا کس پہ برستی
دُنیا میں جُنوں کا جو سمن زار نہ ہوتا

کب رشکِ مسیحا تجھے پہچانتا کوئی
گر دل ہی غمِ عشق کا بیمار نہ ہوتا

جب ترکِ وفا تجھ کو تھی منظور تو ظالم
مائل بہ کرم تو ، دمِ گفتار نہ ہوتا

گر جان بھی دیتے تو ستمگار کو انور
انکار تو ہوتا مگر اقرار نہ ہوتا

(۲۵)

محفل میں دُور ہی سے نہ ہم کو دِکھا شراب
ساقی کبھی تو شوق سے بڑھ کر پلا شراب

تھی بحث کیا ہے اصل میں غارتگرِ حیات
کہنے لگے شباب تو میں نے کہا شراب

اُس چشمِ مست کا یہ تصرّف تھا بزم میں
ساغر تھا دلنواز تو تھی جانفزا شراب

اک ایسا ربط بھی تھا کبھی چشمِ ناز سے
مَے بھی بغیرِ جام تو مستی بِلا شراب

ساقی نے قید جب سے لگا دی شراب پر
خود میرا کیفِ شعر مجھے ہو گیا شراب

اُس چشمِ مَے گسار کا اللہ رے اثر،
عالم تمام عالمِ مستی میں تھا شراب

انورؔ چھپا چھپا کے ذرا پی بھی لی تو کیا
پیتے ہیں جب تو آپ پئیں برملا شراب

(۲۶)

انکار کی صورت ہے نہ اقرار کی صورت
واللہ عجب ہے نگہِ یار کی صورت

اِک بادِ بہاری کے نہ آنے سے چمن میں
مُرجھا کے ہر اک پھول ہوا خار کی صورت

ہے میکدہ یہ شیخ ذرا سوچ کر آئیں،
چلتی ہے یہاں کب کوئی پندار کی صورت

جب آپ کو نفرت ہے مئے عشق سے ناصح
کیوں آپ کھڑے تکتے ہیں میخوار کی صورت

بھر بھر کے دئے جام رقیبوں کو سرِ بزم
ہم دیکھتے ہی رہ گئے سرکار کی صورت

یاں جان بھی دے دی غمِ فرقت میں کسی نے
تم دیکھنے اب آئے ہو بیمار کی صورت

زندہ ہیں ترے ہجر میں اے دوست مگر اب
ہے سانس رواں سینہ میں تلوار کی صورت

یوں جام بھی دیتے ہیں سرِ بزم وہ ہم کو
ہوتی ہے مگر اور ہی کچھ پیار کی صورت

دیں جان بھی گر جان کے بدلے کہیں انورؔ
بن جائے کوئی یار کے دیدار کی صورت

(۲۷)

دُنیا ہے جہانِ نائیِ پیمانِ محبّت
عقبیٰ ہے مری حاصلِ ایمانِ محبّت

یہ آہ و فغاں اور یہ تنہائی و وحشت
اربابِ محبت کو ہیں سامانِ محبّت

وہ مستیِ انداز وہ گفتار کی شوخی
ہے اصل میں اک روح تو اک جانِ محبّت

اظہار مرے غم کا نہ کبھی عرضِ تمنّا
وہ شانِ محبت ہے یہ ہے آنِ محبّت

جل مَرنا ترے حُسن پہ پروانۂ دل کا
دشواریٔ ادراک ہے آسانِ محبّت

ہوتا ہے کسی زُلف کا کب قُرب میسّر
مِلتا ہے کہاں سایۂ دامانِ محبّت

انورؔ ہے یہاں جُرم فغاں ہو کہ شکایت
ہے شہرِ محبت میں یہ فرمانِ محبّت

(۲۸)

دلِ ما را کہ سرِّ دلبراں دارد
مقامِ خاص چشمِ قدسیاں دارد

شرارِ غم کہ مہجوری فروزاں کرد
زسوزِ عشق قلبِ ما تپاں دارد

رقیباں عجزِ ما دید و بمی دانند
کہ خاکِ ما شررہائے نہاں دارد

خیالِ حسنِ تو سرمایۂ ما است
کہ جذبِ عشق ہر لحظہ جواں دارد

دلِ ما خود کہ اصلِ ہستیِ ما است
بمثلِ قطرۂ جانِ ناتواں دارد

زِ چشمِ یار آنکہ بادہ مِی نوشد
بحُجا چشمے بجامِ ارغواں دارد،

بجز زحمت چہ حاصل شُد ترا انور
بصحنِ کعبہ دل اندر بتاں دارد

(۲۹)

آزما لو عاشقِ دلگیر پر — ناز ہو جس تیغ پر جس تیر پر

پھر کسے معلوم موقع کب ملے — وار اک بھرپور ہو نخچیر پر

کام آئے کچھ نہ فریاد و فغاں — مر مٹے ہم حسرتِ تاثیر پر

کب چھپے گی وہ نگاہوں سے مری — لاکھ پردے ڈالئے تصویر پر

سینکڑوں وعدے ہیں محرومِ وفا — کیا بھروسہ ہو بتِ بے پیر پر

ہو ہی جائے آج یہ قصہ تمام — ہاتھ کیوں رکھا رہے شمشیر پر

کر لیا اُس زُلف نے آخر اسیر — تھی نظر اپنی نہ اِس زنجیر پر

مِٹ سکے گا کب لکھا تقدیر کا — دسترس کس کو ہے اِس تحریر پر

چل سکی تقدیر کے آگے نہ کچھ

ناز تھا انور بہت تدبیر پر

(۲۰)

دل مرا ہے مائل آہ دُبر کا تیرے بغیر
درد ہے دُونا جگر میں جلد آ تیرے بغیر

درد کیا فریاد کیا آہِ دل انوگار کیا،
سامنا ہر ایک کا کرنا پڑا تیرے بغیر

لے کے آیا ہے وہاں تک یہ جنونِ شاد کام
غیر ممکن تھا جہاں تک پہنچنا تیرے بغیر

ہجر میں تیرے بصد مجبوری دبے چارگی
یاد میں رویا کئے دردآشنا تیرے بغیر

تو نہیں تو کچھ نہیں انور کو لطفِ زندگی
محفلِ دنیا ہے سونی بے وفا تیرے بغیر

(۳۱)

کبھی "نہیں" سے کبھی ہے لفظِ "ہاں" سے گریز

ہے بات بات میں اُن کو مرے بیاں سے گریز

وہی مقام تو ہے رُوحِ داستاں اے دوست

بیانِ عشق میں تُو نے کیا جہاں سے گریز

ادائے خاص تھی وہ بھی تو اک عنایت کی

سمجھ رہے تھے جسے لوگ داستاں سے گریز

عجب یہ راز ہے اظہارِ راز میں اے دوست

ہوا ہے خود جو اُنہیں اپنے رازداں سے گریز

سمجھ رہا ہوں تری ہر ادا کی رنگینی
مرے خیال سے نفرت ہو یا بیاں سے گریز

اُسی ادا میں نہاں اعترافِ عشق بھی ہے
وہی ادا جو بظاہر ہے داستاں سے گریز

کوئی تو بات ہے جس کے سبب سدا انور
بیاں سے پہلے وہ کرتے ہیں داستاں سے گریز

(۳۲)

اک لذتِ گم گشتہ انجام کا تابع
جس رند کو دیکھو ہے وہی جام کا تابع
بندہ کوئی شہرت کا کوئی نام کا تابع
شاید ہی نظر آئے کوئی کام کا تابع
غربت ہو مصیبت ہو مسرت ہو کہ عشرت
مومن ہے ہر اک حال میں اسلام کا تابع
منزل پہ پہنچنا ہے تو ہر ایک قدم پر
آغاز کو رکھ دیجئے انجام کا تابع ،

شایانِ اطاعت مرا ایماں نہ عمل ہے
کہنے کو مسلماں ہوں مگر نام کا تابع

سب عرض کے تابع ہیں بہ اندازِ ضرورت
یاں خواص کا تابع نہ کوئی عام کا تابع،

کہنے کو مسلماں ہیں مگر اصل میں انور
جب دیکھئے دل اپنا ہے اوہام کا تابع

(۳۴۳)

یاد میں انورؔ کسی کی اب بھی کھو جاتا ہے دِل

عید جب آتی ہے تو مغموم ہو جاتا ہے دِل

گاہے گاہے اشک برسا کر کسی کی یاد میں

خود غبارِ غم کو اپنے آپ دھو جاتا ہے دل ،

اب سرِ محفل بھی اے جانِ جہاں تیرے بغیر

جاگتی رہتی ہیں آنکھیں اور سو جاتا ہے دِل ،

خود مجھے بھی اب نہیں معلوم کب تک ہجر میں

رات کو روتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے دل

ہو نہ ہو آباد لیکن ہر زمینِ شعر میں
اشک کے دانے بڑی حسرت سے بو جاتا ہے دل

دیکھتا ہوں جب کسی مظلوم کی آنکھوں میں اشک
خود بخود برس پڑتی ہیں آنکھیں خون ہو جاتا ہے دل

کیا کہیں انور کسی سے دل کی رنجوری کا حال
یاد آتا ہے کوئی بے چین ہو جاتا ہے دل

۴۳

دل اک ستم شعار سے اپنا لگا کے ہم
بیٹھے ہیں زندگی کو مصیبت بنا کے ہم

اے دوست تیرے عشق نے پہنچا دیا کہاں
اب خود کو ڈھونڈتے ہیں ترے پاس آ کے ہم

ہے کس لئے غرور تمہیں اپنے آپ پر
بندے خدا کے تم ہو تو بندے خدا کے ہم

دل ہی نہیں شعورِ غم دل بھی دوستو
آئے ہیں بزمِ یار میں سب کچھ لٹا کے ہم

وہ خفتہ نشاط ہیں انور کہ دیکھنا
جاگیں گے اب جہاں میں قیامت جگا کے ہم

(۳۵)

ہجر کی راتوں میں اکثر یاد آجاتے ہو تم
اور اک خوابیدہ حسرت کو جگا جاتے ہو تم

اب بھی یہ عالم ہے اک خواب پریشاں کی طرح
بھولتا ہوں لاکھ لیکن یاد آجاتے ہو تم

ایک مدت ہو گئی ترکِ تعلق کو مگر،
آج بھی احساس کی دنیا پہ چھا جاتے ہو تم

تم کو کب احساس ہے اِس کا کہ چشمِ ناز سے
سامنے آتے ہو تو بجلی گرا جاتے ہو تم

وہ نگاہیں جو بظاہر ہیں بہت معصوم سی
اُن نگاہوں سے قیامت دل پہ ڈھا جاتے ہو تم

کچھ عجب عالم ہے جتنا بھولنا چاہتا ہوں میں
اُتنی ہی شدّت سے مجھ کو یاد آجاتے ہو تم

شکریہ ہمدردیوں کا دوستو لیکن مجھے
یاد اک بھولے ہوئے غم کی دلا جاتے ہو تم

دل کو کچھ ایسا تعلق ہے تمہاری ذات سے
جب ستاتا ہے کوئی تو یاد آجاتے ہو تم

کوئی کیا سمجھے گا انور کس کے غم کی داستاں
شاعری میں اپنی دنیا کو سنا جاتے ہو تم

(۳۶)

زندگانی کو حیاتِ جاوداں سمجھے تھے ہم
یعنی گردِ کارواں کو کارواں سمجھے تھے ہم

شومیٔ قسمت سے وہ بھی آج ہم سے پھر گئیں
اُف وہ نظریں جن کو اپنا رازداں سمجھے تھے ہم

کھو چکے تو کچھ ہمیں قیمت کا اندازہ ہوا
آہ وہ اِک عُمر جس کو رائیگاں سمجھے تھے ہم

ایسا اک عالم بھی گذرا ہے وفورِ شوق میں
جب ہر اک لمحے کو عمرِ جاوداں سمجھے تھے ہم

ابتدائے عشق میں احساس کا عالم یہ تھا
ہر نفس کو اک حیاتِ جاوداں سمجھے تھے ہم

اک سہارے پر ترے کیا کیا مصیبت سہہ گئی

ہستیِ دل جس کو جانِ ناتواں سمجھے تھے ہم

دے سکے گا ساتھ اپنا تُو نہ اک دو گام بھی،

تجھ کو اے جانِ جہاں ایسا کہاں سمجھے تھے ہم

انورؔ اک طرزِ تغافل، بے وفائی، بے رُخی

بس اِنہی الفاظ کو اک داستاں سمجھے تھے ہم

(۳۷)

حسن کی مجبوریوں کو بے رُخی سمجھے تھے ہم
انتہائے کشمکش کو خامشی سمجھے تھے ہم

شمع کے خاموش جلنے پر نہ تھی ہرگز نظر
رقصِ پروانہ کو وصلِ عاشقی سمجھے تھے ہم

اپنا سب کھو کر بھی کچھ احساسِ محرومی نہ تھا
آپ کے غم کو متاعِ زندگی سمجھے تھے ہم

جی رہے تھے اک ادائے دلبری کے وہم میں
بے رُخی کو کب کسی کی بے رُخی سمجھے تھے ہم

گو کوئی وعدہ نہ تھا لیکن نہ جانے کس لئے
آپ آنے کو ہیں بس یہ ہر گھڑی سمجھے تھے ہم

عقل پر جب تک تھا اپنی خود فریبی کا حجاب
جہلِ مُطلق کو بھی عینِ آگہی سمجھے تھے ہم

قبر میں آئے تو انور بُجھ گیا اُس کا بھرم
زندگی کب تھی وہ جس کو زندگی سمجھے تھے ہم

(۳۸)

حسیں ہزار ہیں دُنیا میں صد ہزار جواں
مگر بہارِ تمنّا ترا جواب کہاں

جہاں میں کس کو مِلا ہے ترا وصال کہ تُو
عیاں بھی ہے تو بہ اندازِ رازہائے نہاں

شبِ فراق کے لمحے بھی اہلِ دِل کے لئے
فروغِ جذبِ محبّت حصُولِ راحتِ جاں

رفیقِ راہِ محبّت ہیں دیکھئے کیا کیا
جنُونِ عشق، غمِ آرزو و قلبِ تپاں

رہے اُمید نہ دل میں کوئی کہ اے انورؔ
وصالِ دوست مقدّر میں بار بار کہاں

(۳۹)

چمن والے بھی جب صیّاد کے دمساز ہو جائیں
عجب کیا دشمنِ بلبل پرِ پرواز ہو جائیں

صدا اک طائرِ بسمل کی کیا پہنچے گی گلشن تک
اسیرانِ قفس آؤ کہ ہم آواز ہو جائیں

مسافر وہ بھلا پہنچے گا کیا کعبے کی منزل کو
شریکِ راہ جس کے یہ بُتانِ ناز ہو جائیں

ہلاکت خیزیاں اُس کی بھی دیکھا چاہئیں چل کر
وہ دنیا جس میں انساں خود مُقدّر ساز ہو جائیں

نہ ہو جب دِل ہی آسودہ تو انور کیا تعجب ہے
ڈھلیں آہوں میں نغمے ساز بے آواز ہو جائیں

(۴۰)

گھبرا گیا ہوں کشمکشِ زندگی سے میں
زندہ ہوں ہجر یار میں بیچارگی سے میں

مِلنا محال بھُولنا ممکن نہیں تجھے
زندہ ہُوں تیرے ہجر میں کِس بے بسی سے میں

اِس زندگی میں عشق خُدارا نہ کیجیے
کہتا ہوں اب تو دوستو یہ ہر کسی سے میں

الزام کیوں کسی کی نگاہِ ستم کو دوں،
خود مِٹا ہوں عشق میں اپنی خوشی سے میں

تم نے تو نام تک نہ وفا کا کبھی لیا
مجبور ہو گیا ہوں بس اپنے ہی جی سے میں

خود رہبروں کے ہاتھ جو بھٹکا ہوں راہ سے
منزل کو دیکھتا ہوں بڑی بے کسی سے میں

منزل وفا کی عشق میں انورؔ ابھی کہاں
بس مُلتجی ہوں چشمِ کرم کا کسی سے میں

(۴۱)

وہ کسی اور پہ مائل تو نہیں
ہم سا کوئی کہیں بسمل تو نہیں

اُن کو کیا حال بتاؤں جا کر
وہ مرے حال سے غافل تو نہیں

دو قدم بھی ہُوا چلنا دُوبھر
یہ کہیں یار کی منزل تو نہیں

توڑ ڈالا سرِ محفل تم نے
جیسے ساغر تھا مرا دل تو نہیں

زندگانی میں کہاں چین ہمیں
اک طلاطم ہے یہ ساحل تو نہیں

وہ کہیں تو کسی دیوانے کو
جان دینا کوئی مشکل تو نہیں

کوئی آیا ہے سرہانے انورؔ
دیکھو دیکھو مرا قاتل تو نہیں

(۴۲)

یوں تو سب کچھ ہے مگر یہ دِل سکوں پاتا نہیں
جس کو نظریں ڈھونڈھتی ہیں وہ نظر آتا نہیں

آنے والوں میں ہیں صبح و شام ابر و باد بھی
لیکن اُن کی کچھ خبر یارو کوئی لاتا نہیں

منزلیں ایسی بھی کچھ آتی ہیں راہِ شوق میں
دو قدم بھی آدمی سے جب چلا جاتا نہیں

کام اپنا کر گئیں لیکن نگاہیں یار کی
کِس قدر خاموش ہیں جیسے کہ کچھ آتا نہیں

اُس گلی کے ذرّہ ذرّہ میں بَلا کی ہے کشش
جو بھی جَاتا ہے وَہاں وہ لوٹ کر آتا نہیں
بار رَہا پُوچھا کِسی نے پر نہ جَانے کِس لیئے
حَال یہ ہے حَالِ دل ہم سے کہا جَاتا نہیں
کوئی جَب آتا ہے انورؔ سَاغر و مینا لیئے
لاکھ کیجے ضبط پر دِل سے رَہا جَاتا نہیں

(۴۳)

ظاہر میں گو عیاں ہے حقیقت عیاں نہیں
یہ راز وہ ہے جس کا کوئی رازداں نہیں

سمجھو تو کائنات کی ہر شے پہ ہے محیط
دیکھو تو کوئی خالق و مالک یہاں نہیں

کچھ حُسن میں کشش ہے نہ کچھ عشق میں گداز
بے کیف زندگی ہے اگر دِل جواں نہیں

گذری تمام عمر یہی سوچتے ہوئے،
جلوہ کُناں وہ شوخ کہاں ہے کہاں نہیں

(۴۴)

جہاں تک زمان و مکاں دیکھتے ہیں
تماشائے حُسنِ نہاں دیکھتے ہیں

جدھر دیکھتے ہیں جہاں دیکھتے ہیں
فقط تیرا جلوہ وہاں دیکھتے ہیں

جنہیں ذوقِ حُسنِ ازل مل گیا ہے
وہ کب سوئے کون و مکاں دیکھتے ہیں

ترا حُسن آنکھوں میں کیا بس گیا ہے
جسے دیکھتے ہیں جواں دیکھتے ہیں

رسائی نہ اپنی ہوئی خود اُسی تک
جسے اپنے اندر نہاں دیکھتے ہیں

یہ دُنیا ہر اک آن ہے منقلب سی
کہاں دیکھتے تھے کہاں دیکھتے ہیں

خبر کچھ نہیں ہے کہ ہنگامِ مستی
کسے دیکھتے ہیں کہاں دیکھتے ہیں

نہ پُوچھو کہ دھوکے میں ہم دوستی کے
عداوت کے کیا کیا نشاں دیکھتے ہیں

عجب بات ہے ہم حقیقت کو انورؔ
بہ اندازِ وہم و گماں دیکھتے ہیں

(۴۵)

مرتے ہیں زندگی کو مگر زندگی کہاں
اِس زندگی میں زیست کو پائندگی کہاں

دراصل حُسنِ یار ہے اِن سب میں مُنعکس
ورنہ مہ و نجوم میں تابندگی کہاں

کرنیں ضیائے حُسن کی رقصاں اُفق پہ ہیں
تاروں میں دیکھئے تو یہ رخشندگی کہاں

سرکش ہے اپنے خالق و رازق سے ہر ملا
لیکن بشر میں جذبۂ شرمندگی کہاں

یہ زُعم تم کو دیکھنا زاہد ڈبو نہ دے
جس بندگی میں زُعم ہو وہ بندگی کہاں

آشوبِ کائنات میں انسان سینکڑوں
زندہ ہیں یوں تو نام کو پر زندگی کہاں
انوارِ تمام زہد و ریاضت کے باوجود
دعویٰ ہے بندگی کا مگر بندگی کہاں

(۴۶)

شوخی میں دلبری میں ستم میں حیا میں حسن
چھلکے ہے مستِ ناز کی ہر اک ادا میں حسن

دیکھو تو سادگی ہر اک انداز سے عیاں
سمجھو تو سادگی میں جفا ہے جفا میں حسن

دل ہو اگر اُداس تو ہر شے اُداس ہے
تاروں میں روشنی نہ قمر کی ضیا میں حسن

ایجاد ہے یہ حضرتِ انساں کے ذہن کی
بلبل میں نغمگی گلِ رنگیں قبا میں حسن

ذوقِ سلیم ہو تو گلوں کے سوا بھی دیکھ
ہر شے پہ ہے محیط چمن کی فضا میں حُسن

موقوف کچھ یہ اپنی ہی فکر و نظر پہ ہے
شبنم میں تازگی ہے تو موجِ صبا میں حُسن

انور جواں ہے دل تو جدھر کیجئے نظر
ذرّوں میں دلکشی تو خلا و فضا میں حُسن

(۴۷)

کچھ ہوش تیری بزم میں انجام کا نہیں
تو سامنے ہے ذہن مگر کام کا نہیں

میں نے جو اپنی یاد دلائی تو یوں کہا
عاشق ہمارا کوئی بھی اِس نام کا نہیں

یلغار میکدے پہ اب اہلِ ہوس کی ہے
اے میکشو یہ وقت کچھ آرام کا نہیں

روزہ نماز و حج کہ ہو صدقہ و زکوٰۃ
بے طاعتِ رسولؐ کوئی کام کا نہیں

حق پر ہو اعتقاد مگر کفر سے خلوص
ایسا کوئی اصول تو اِسلام کا نہیں

اکثر ہوا کہ طے نہ ہوا ایک عمر میں
وہ راستہ جو اصل میں دو گام کا نہیں

ٹھہری جو شرطِ بادہ کشی کجروی تو پھر
ہم کو بھی کوئی ذوقِ مے و جام کا نہیں

انورؔ جو دم ہے اُس کو غنیمت ہی جانئے
کچھ اعتبار اَب سحر و شام کا نہیں

(۴۸)

انورؔ خیال لغزشِ عہدِ شباب میں
اِک عمر ہو گئی کہ ہے دل پیچ و تاب میں

کہتے ہو اک نگاہ کی قیمت ادا کروں
اچھّا انورؔ کھیں آپ مرا دِل حساب میں

لذّت تو چشمِ یار کے لطف و کرم میں ہے
ورنہ رکھا ہی کیا ہے بجز نشہ شراب میں

دُنیائے عشق کے ہیں طریقے جُدا کہ یاں
ہے اضطراب سُکوں میں تو سکوں اضطراب میں

سب زندگی کے طور طریقے بدل گئے
اب ہے بدی کرم میں تو نیکی عتاب میں

اَب خط بھی اُن کو لکھنے سے کچھ فائدہ نہیں
"میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میںؔ"

آنکھیں کھُلیں تو منزلِ پیری تھی سامنے
عہدِ شباب جیسے کہ آیا تھا خواب میں

گذری ہے اہلِ دِل پہ اِک ایسی بھی کیفیت
لذّت جو تھی کرم میں وہی تھی عتاب میں

آساں نہیں ہے حُسن سے وعدہ نباہ کا
انورؔ نہ مُبتلا ہو کوئی اِس عذاب میں

ؔ : یہ مصرع مرزا غالبؔ کا ہے۔

(۴۹)

اٹھتا ہے نقابِ رُخِ جاناں کوئی دم میں
ہونے کو تباہی کا ہے ساماں کوئی دم میں

یوں ہو گئی آزاد اگر فطرتِ انساں
ڈھونڈے سے ملے گا نہ پھر انساں کوئی دم میں

تسکینِ ہوسِ ناکیٔ فطرت کی طلب میں
انسان ہوا جاتا ہے عریاں کوئی دم میں

پرواز کی جرأت ہو تو خود اہلِ قفس میں
کھل جائے گا خود ہی درِ زنداں کوئی دم میں

ہوں پہلے مسلماں تو مسلمان اے انورؔ
بن جائیں گے کافر بھی مسلماں کوئی دم میں

(۵۰)

مست کُن، میخوار کُن، بدنام کُن
ساقیا برخیز و مئے در جام کُن[1]

ابر و باد و موسمِ گُل خوشگوار
عیش کُن، دلشاد کُن، آرام کُن

رونقِ گُلشن گُلِ رنگیں شدہ
رونقِ محفل رُخِ گلفام کُن

دُور کن زِ روئے رنگیں ایں نقاب
ہر دلِ عاشق کہ بینی رام کُن

اے کہ از تو ہر دو عالم کامیاب
یک نظر بر انورِ ناکام کُن

[1] یہ مصرع حکیم سنائیؒ کا ہے۔

(۵۱)

کسی کے لبوں پر ہیں بے تاب آہیں
کوئی ڈالے پھرتا ہے باہوں میں باہیں

محبّت کے مارے کدھر ہو کے جائیں
ہوئی ہیں جو مسدُود ہر سمت راہیں

نہیں آپ سے عُذر کچھ بھی مری جاں
کہ حاضر ہے سر بھی اگر آپ چاہیں

وہ آئیں گے جا کر صبا سے یہ کہہ دو
کہ پھولوں سے بھر دے وہ گلشن کی راہیں

مِلا چین مجھ کو نہ الفت میں انورؔ
شب و روز بھرتا ہوں آہوں پہ آہیں

(۵۲)

جب رات میں غم سے گھبرا کر میں اُن کو پکارا کرتا ہوں
وہ سامنے آ ہی جاتے ہیں جی بھر کے نظارہ کرتا ہوں

وہ مست و جواں و نغمہ سرا چپ چاپ گذر ہی جاتے ہیں
میں حسرت و حیرت کا مارا بس یونہی پکارا کرتا ہوں

کیا رنج و الم کیا آہ و فغاں کیا طعنے اور کیا سب و شتم
اک تیرے لئے ہی دُنیا کی ہر چیز گوارا کرتا ہوں

ہر رات ہجومِ غم میں ہی اک ایسا وقت بھی آتا ہے
جب ہاتھ سے اپنے اُن کے میں بالوں کو سنوارا کرتا ہوں

اب خیر ہو انور جانِ حزیں کی آج مجھے کیوں رہ رہ کر
اُن کا ہی تصوّر آتا ہے میں جن سے کنارا کرتا ہوں

(۵۳)

کمی کچھ آ نہیں سکتی خدا کی شان عظمت میں
لگائے لاکھ زور اپنا کوئی انکار وحدت میں

بتاؤ صدق دل سے کچھ تو اے دنیا کے دیوانو
بجز افسوس پایا تم نے کیا دنیا کی چاہت میں

وہ جیسا ہو تعلق تھا مگر اسلام سے ہم کو
سو وہ بھی کھو دیا ہم نے زمانے کی سیاست میں

ہوا احساس اپنی خامیوں کا کھل گئیں آنکھیں
ملا تکلیف میں جو مل سکا نہ ہم کو راحت میں

بگڑ کر رہ گئے اعمال اور ایمان کھو بیٹھے
اگر پایا تو یہ پایا شیاطیں کی رفاقت میں

سنبھل ناداں کہ اب منزل قریب الختم ہے تیری
دم پیری ہے ہر دم موت ہے اب تیری چاہت میں

میں انور پوچھتا ہوں فلسفہ دانانِ عالم سے
بتاؤ کچھ ملا تم کو کہیں انکارِ وحدت میں

---

(۵۴)

اب نہ کسی سے آس لگائیں اب نہ کسی سے پیار کریں

دے ساتھ اگر یہ دل تو چلیں آباد دنیا سنسار کریں

موقوف ہے اُن پر رُوٹھیں تو گلشن کو بنا دیں ویرانہ

خوش ہوں تو ہر اک ویرانے کو دم بھر میں گُل و گلزار کریں

ہم اُف بھی کریں تو بات بڑھے اور لوگ ہمیں کو طعنہ دیں

لو آج سے ہم خاموش ہوئے اب چاہیں جو سرکار کریں

ہے حسن کسی کا در پردہ ظلمت میں اُجالے کا باعث

یہ بات حقیقت ہے اس کا خواہ اہلِ جہاں انکار کریں

وہ ہم پہ کرم فرمائیں تو اک بار ذرا آجائیں تو
دیں جان بھی قدموں پر اُن کے ہم اُن پہ فدا گھر بار کریں

کیا شکوہ شکایت دُنیا کی کچھ ریت یہی ہے اے انور
دیں جان بھی غیروں کی خاطر اپنوں کو ذلیل و خوار کریں

(۵۵)

خرد کا ذکر نہیں بے خودی کی بات کرو
یہ میکدہ ہے یہاں میکشی کی بات کرو

نہ زُہدِ خشک نہ چنگ و رباب ہی تنہا
بقدرِ ظرف مگر ہاں سبھی کی بات کرو

بہت سکون غمِ عاشقی میں پایا ہے
ابھی کچھ اور غمِ عاشقی کی بات کرو

یہ بُغض و کینہ و نفرت یہ دشمنی توبہ
کبھی تو شیخ ذرا دوستی کی بات کرو

عبث ہے ہستیٔ فانی کی جستجو انورؔ
مئے نشاط پیو بے خودی کی بات کرو

(۵۶)

چاہیئے انسان کو انجام سے غافل نہ ہو
صبح کو بھولے نہ بھولے شام سے غافل نہ ہو

جب نہیں اسلام سے عقبیٰ کی منزل میں مفر
پھر یہ لازم ہے کوئی اسلام سے غافل نہ ہو

ہو چکا آغاز دُنیا کا اب اِس کی فکر کیا
اب تو بس انجام ہے انجام سے غافل نہ ہو

حشر کے ہنگام پر موقوف ہے انجامِ زیست
زندگی میں حشر کے ہنگام سے غافل نہ ہو

صاحبِ ادراک ہے انساں وہی اے دوستو
عیش میں جو گردشِ ایام سے غافل نہ ہو
موت کا پیغام ہے انور یہ تیرا ہر نفَس
ہے اگر کچھ عقل اس پیغام سے غافل نہ ہو

(۵۷)

کرتے ہیں وہ ستم بھی مگر اِس ادا کے ساتھ
مِلتا ہے لُطفِ خاص ہمیں اِبتلا کے ساتھ

اصلِ بقا بھی عالمِ رازِ فنا میں ہے
جس کو بھی ہے بقا تو یہاں ہے فنا کے ساتھ

میری شکایتوں پہ نہ جاؤ مگر ذرا،
سوچو کہ ظلم وہ بھی کسی آشنا کے ساتھ

مانا کہ بے رُخی بھی ادا ہے مگر کبھی
دشمن کو بھی تو دیکھتے وہ اِس ادا کے ساتھ

لذّت مِلی کچھ ایسی کہ ہر ایک زخم پر
بسمل لپٹ کے رہ گیا تیغِ جفا کے ساتھ

مہندی رچا کے خوش ہیں مگر پوچھتا کوئی
کتنے دلوں کا خون ہے شامل حنا کے ساتھ

مانوس ہو گئے تھے بس اک چارہ گر سے ہم
ورنہ تھا درد کو نہ تعلق دوا کے ساتھ

اک سانس کی حیات ہے پر اس کے باوجود
بندہ الجھ رہا ہے خود اپنے خدا کے ساتھ

جو لطف دے گیا ہے وہ اقرار میں کہاں
انکار ان کا وہ بھی کسی خاص ادا کے ساتھ

اقرار میں جو لطف ہے وہ قرب میں کہاں
اقرار اور وہ بھی مکمل حیا کے ساتھ

کہتے ہیں سب شمیم جسے ہم سے پوچھئے
آتی ہے بوئے دوست چمن میں صبا کے ساتھ

اِس آرزو میں عمر ہی انور گذر گئی
کٹتی یہ عمر کاش کسی دلربا کے ساتھ

(۵۸)

تماشائے فروغِ آتشِ دیگر دیکھیں گے
وہ مچلے ہیں کہ ہم تو آہ کی تاثیر دیکھیں گے

مصائب عشق کے ہوں یا صعوبت دردِ فرقت کی
دکھائے گا جو تو ہم کو بتِ بے پیر دیکھیں گے

اسی امید پر بیٹھا ہوں میں دیوار سے لگ کر
کبھی وہ مڑ کے مجھ کو صورتِ تصویر دیکھیں گے

خیالِ دل بھی آجائیگا اُس دم زلف والوں کو
کسی مجرم کو جب وابستۂ زنجیر دیکھیں گے

مکر جانا قیامت میں کوئی آساں نہیں انور
ہم اپنا زخم دیکھیں گے وہ اپنا تیر دیکھیں گے

(۵۹)

آدمی اتنا بھی کیا دُنیا سے بیگانہ رہے
خُم فسردہ سے رہیں دیگیر پیمانہ رہے

کچھ غریب اِس سمت بھی بیٹھے ہیں تیری راہ میں
کچھ خیال اِن کا بھی ہاں اے چشمِ مستانہ رہے

کیا بتائیں اُس بتِ کافر کی نظروں کا اثر
اک نظر دیکھا اُنہیں اک عمر دیوانہ رہے

دیکھنا زاہد ہماری پارسائی دیکھنا
مدّتوں ہم، ہم نشینِ پیرِ میخانہ رہے

یُوں ہی گذرے کاش آنوریہ حیاتِ چند روز
جلوہ گر ساقی رہے گردش میں پیمانہ رہے

(۶۰)

زخمِ جگر نہ خونِ رگِ دل کو دیکھئے
بسمل کو دیکھنا ہے تو قاتل کو دیکھئے

راہِ وفا میں کچھ بھی نہیں عشق کے سوا
منزل کو اور توشۂ منزل کو دیکھئے

طوفاں میں خوفِ بادِ مخالف کا کس لئے
مڑ مڑ کے اب نہ کشتی و ساحل کو دیکھئے

اک مشتِ خاک اور یہ عالم ہے عزم کا
دار و رسن کو دیکھئے اور دل کو دیکھئے

دیکھا جو حسنِ یار تو گہنا کے رہ گئے
سورج کو دیکھئے مہِ کامل کو دیکھئے

آجائیں وہ تو دیکھئے پھولوں کی تازگی
وہ ساتھ ہوں تو رونقِ محفل کو دیکھئے

انورؔ نہیں ہے ان میں کوئی باعثِ حیات
آتش کو باد و آب کو یا گِل کو دیکھئے

---

(۶۱)

ہمیں کام اُن کی رضا سے ہے ہمیں لاکھ رنج و اَلم سہی
جو عطا کریں وہ قبول ہے وہ ستم ہو گر تو ستم سہی

مرے حالِ زار پہ خامشی مرے عرضِ شوق پہ بے رُخی
وہ اگر کہیں کہ کرم ہے یہ تو بجا ہے یہ بھی کرم سہی

جو فنا ہوئے رہِ عشق میں اُنہیں فکر کیوں ہو مآل کی
جو بقا نہیں تو فنا سہی جو خوشی نہیں تو اَلم سہی

نہیں فکر کچھ کم و بیش کی وہ جو آپ ہم کو عطا کریں
وہ ہو ایک قطرۂ زہرِ غم کہ شراب اِس سے بھی کم سہی

خوشی اُن کی ہم کو عزیز تر ہے نشاطِ جامِ وصال سے
وہ اگر ہیں خوش تو تمام عمر ہمیں یوں ہی ہجر کا غم سہی

چلو آج انورؔ باوفا کہ نہ حرفِ نامِ وفا پہ آئے
سرِ دار رسمِ وفا سہی نہیں اور کوئی تو ہم سہی

(۶۲)

محبوب میرا یکتائی ہے
سارا جہاں شیدائی ہے

کب بادِ صبا نے چھیڑا ہے
پھولوں کو ہنسی خود آئی ہے

خاموش رہیں کیوں دیوانے
گھنگھور گھٹا جب چھائی ہے

پھر آؤ چلیں میخانے کو
برسات کہاں روز آئی ہے

جس چیز نے ہم کو مارا ہے
ظالم وہ تری انگڑائی ہے

کیا جانے کہاں وہ پنہاں ہیں
اے شوق تری بن آئی ہے

بیساختہ کلیاں کھلنے لگیں
پیغام صبا کیا لائی ہے

مستی میں فضا کی بات ہی کیا
ہر موجِ صبا شہنائی ہے

میں خود بھی سراپا حیرت ہوں
تقدیر کہاں لے آئی ہے

اِک اُن کے ذرا آجانے سے،
ہر چیز پہ رونق چھائی ہے،

انور نہ جفا سے گھبراؤ
ہر شب کی سحر بھی آئی ہے

(۶۳)

دُنیا میں بھلا کس پہ یہ اُفتاد پڑی تھی
گذری جو ترے غم میں قیامت کی گھڑی تھی

کیا دور تھا جب عقل پہ غلبہ تھا جُنوں کا
کیا وقت تھا جب آنکھ کسی بُت سے لڑی تھی

آئے جو سرِ بزم تو آسان تھیں راہیں
پہنچے جو سرِ دار تو منزل یہ کڑی تھی

کیا جانئے کیوں آج ہے رُسوا کہ جُنوں کی
کل تک تو بہت بات زمانے میں بڑی تھی

ملتے ہی گلے یار سے یوں ٹوٹ کے برسی
اشکوں کی گھٹا جیسے برسنے کو کھڑی تھی

گذرے ہیں شب و روز ترے ہجر میں لیکن
آہوں کا طلاطم تھا تو اشکوں کی جھڑی تھی
انور تھی وہی حاصلِ کُل عمرِ جہاں میں
ساعت جو محبت کی جوانی کی گھڑی تھی

(۶۴)

نظر کی اگر چوٹ کھائی نہ ہوتی
تو یُوں جان اپنی گنوائی نہ ہوتی

نہ مِلتا اگر اُس نظر کا اشارہ
یہ دُنیا ہمیں راس آئی نہ ہوتی

جفا کو اگر ہم جفا ہی سمجھتے
محبّت کی جلوہ نمائی نہ ہوتی

محبّت میں تھا بیر ہی گر وفا سے
تو یہ آگ دل میں لگائی نہ ہوتی

اُجڑنا ہی تھی دل کی دُنیا جہاں میں
تو یہ بھُول کر بھی بسائی نہ ہوتی

نہ اقرار پر تھا خود اپنے بھروسہ
تو یوں آس ہم کو دلائی نہ ہوتی،

ذرا ضبط سے کام لیتے جو انور
تو یوں جان پر ہی بن آئی نہ ہوتی

(۶۵)

مدتوں ہم جانبِ شمس و قمر دیکھا کیے

اُن کو جب دیکھا تو پھر حسنِ نظر دیکھا کیے

اُن کے جلوؤں کی بھلا تابِ نظارہ کس کو تھی

ہم تو واں اک عالمِ حیرت اثر دیکھا کیے

موت آئی اور اپنا کام پورا کر گئی

حالتِ بیمار بیٹھے چارہ گر دیکھا کیے

ایک وہ ہیں باریابی جن کو حاصل ہو گئی

ایک ہم ہیں عمر بھر دیوار و در دیکھا کیے

ایک تھا غرقابِ خوں اور دوسرا زخموں سے چور

تیر وہ اپنا تو ہم اپنا جگر دیکھا کیے

کچھ تو بزمِ ناز میں پیتے رہے بھر بھر کے جام
کچھ کھڑے حسرت سے ساقی کی نظر دیکھا کئے

جا چکے منزل کو انورؔ گر یہی حالت رہی
کارواں گذرا کئے تم رہگذر دیکھا کئے

---

(۶۶)

چشمِ ساقی میں محبت نظر آتی ہے مجھے
یعنی اب وصل کی صورت نظر آتی ہے مجھے

ابتدا میں تھی محبت بڑی آساں لیکن
انتہا میں تو قیامت نظر آتی ہے مجھے

کوچۂ عقل سے چل دشتِ جنوں کو اے دل
اس بیاباں میں تو وحشت نظر آتی ہے مجھے

کچھ عجب حال ہے دل کا کہ وفورِ غم میں
اب ملاقات بھی فرقت نظر آتی ہے مجھے

کہیئے کیا اور اسے کو زرگاہی کے سوا

روزِ روشن میں بھی ظلمت نظر آتی ہے مجھے

کچھ نہ کچھ جام میں ساقی نے ملایا ہے ضرور

کچھ نگاہوں میں شرارت نظر آتی ہے مجھے

گمرہی عقل کی پہنچی ہے یہاں تک انور

زندگی خیال کی صورت نظر آتی ہے مجھے

(۶۷)

خواہشِ دُنیا عدوئے جان ہو کر رہ گئی
زندگانی موت کا سامان ہو کر رہ گئی

چارہ سازی موت کے آگے نہ مطلق چل سکی
ہر دوا خود باعثِ نقصان ہو کر رہ گئی

ہو چکا دل خُوں کسی کا جب تو وہ کافر نظر
کِس قدر معصوم کیا انجان ہو کر رہ گئی

پھر گئیں جب وہ نگاہیں توز گاہِ عشق میں
کائناتِ رنگ و بُو ویران ہو کر رہ گئی

اتفاقاً آج اُس نے پیار سے دیکھا ہی تھا
موجِ بحرِ آرزو طوفان ہو کر رہ گئی

اک وفا دشمن نے آخر جس کو ٹھکرا ہی دیا
وہ تمنا حسرت و ارمان ہو کر رہ گئی

کس قدر افسوس کا عالم ہے انساں کیلئے
بے یقینی حاصلِ ایمان ہو کر رہ گئی

فرقتِ خورشید میں انورؔ یہ ہوتا ہے گماں
جیسے دنیا واقعی سنسان ہو کر رہ گئی

ط اہلیہ مرحومہ خورشید بیگم

(۶۸)

اَب کے گلشن میں عجب فصلِ بہار آئی ہے
گُل شگفتہ ہیں اُداسی سی مگر چھائی ہے

دن ہو یا رات مگر داغ جلے جاتے ہیں
اِن چراغوں نے نہ بجھنے کی قسم کھائی ہے

تجھ کو میں اے غمِ محبوب بھلا دوں کیوں کر
تجھ سا دُنیا میں کہاں مُونسِ تنہائی ہے

بے بسی پر مری خنداں ہیں مثالِ انجُم
ہجر کی شب مرے داغوں کی بھی بَن آئی ہے

اب تو انورؔ ہے خموشی ہی مناسب ورنہ
عرضِ غم میں تو بہت خطرۂ رسوائی ہے

(۶۹)

قطرہ میں سمندر کا جلوہ نظر آتا ہے
ہر ذرّہ حقیقت میں دنیا نظر آتا ہے

ہر قطرہ کہ ظاہر میں کیا جسکی حقیقت ہے
سمجھو تو حقائق کا دریا نظر آتا ہے

اُلفت میں کچھ ایسے بھی آتے ہیں مقام اکثر
ہر لمحہ قیامت کا نقشہ نظر آتا ہے

وہ حُسن کہ مصروفِ جلوہ ہے پسِ پردہ
نیرنگیٔ عالم میں کیا کیا نظر آتا ہے

انور یہ لطافت کی حد ہے کہ نگاہوں کو
جلوہ بھی حقیقت میں پردا نظر آتا ہے

(۷۰)

یہ دردِ محبّت ہے دُعا دے نہ دوا دے
بیمار کو بس اپنے ہی دامن کی ہوا دے

یوں آج لبِ حسن پہ اقرار وفا کا
اے عشق ذرا عمرِ گذشتہ کو صدا دے

مائل بہ کرم آج ہے وہ جانِ تمنّا
اے جذبِ جنوں اپنے مقدر کو دُعا دے

وہ حسن ہے کیا اُس سے جفاؤں کی شکایت
میں عشق ہوں اُس کو مرا پیغامِ وفا دے

جذبات کی گرمی سے بچا دامنِ دل کو
انور یہ کہیں خرمنِ ہستی نہ جلا دے

(۷۱)

سیرِ دُنیائے خرابات کی دعوت دی ہے
آج اِک بُت نے ملاقات کی دعوت دی ہے

اتنی خاموش نگاہی سے پُکارا اُس نے
کچھ نہ سمجھا کوئی کس بات کی دعوت دی ہے

اُن سے کہدو کہ اِس انداز سے دیکھا نہ کریں
کوئی سمجھے کہ ملاقات کی دعوت دی ہے

ہوش ہی جب نہ رہا جام و سبُو کا ساقی ،
تُو نے میخانے میں اک رات کی دعوت دی ہے

جلوۂ یار میں گُم ہو گئے ایسے سرِ بزم
کچھ نہ تھا ہوش کہ کس بات کی دعوت دی ہے

ایسی مغموم فضاؤں میں اُٹھا کر ساغر
ہم نے تبدیلیٔ حالات کی دعوت دی ہے

چاندنی رات میں ساقی نے بُلا کر ہم کو
عیش رنگینیٔ اوقات کی دعوت دی ہے

اپنی نادیدہ تجلّی کا بنا کر شیدا
رونق افروزیٔ ظُلمات کی دعوت دی ہے

دل نے گر ساتھ دیا ہم بھی چلیں گے انورؔ
اُس نے میخانے میں کل رات کی دعوت دی ہے

(۷۲)

چھوٹا جو حرم کوئے بتاں تک پہنچے
بھٹکے تو پھر انسان نہاں تک پہنچے

لوٹے حرم و دیر سے ہو کر مایوس
ہم اُن کی طلب میں رگِ جاں تک پہنچے

تھے راہِ پہ جب تک تو یقیں تھا کامل
بھٹکے تو فقط وہم و گماں تک پہنچے

کیا جانئے کس وقت وہ ایفا ہونگے
وعدے جو کبھی اُن کی زباں تک پہنچے

ٹکرائیں وہ نظریں تو ہوا یوں محسوس
نشتر کئی جیسے رگِ جاں تک پہنچے
کہنا تو بہت کچھ تھا ہمیں بھی انور
الفاظ نہ کچھ اپنی زباں تک پہنچے

(۷۳)

چھُپ گیا خورشید وقتِ شام ہے
اب چلو انور یہاں کیا کام ہے

رات بھر تڑپا مریض اور صبح کو
آنکھ بند کر لی کہا آرام ہے

ہے سُکونِ دائمی پا کر خموش
مرنے والا کتنا خوش انجام ہے

موت کیا ہے صبحِ تازہ کی نمود
گو بظاہر زندگی کی شام ہے

کس قدر خاموش کتنا پُرسکوں
اے مریضِ غم ترا انجام ہے

ایک لمحے میں گئی دُنیا بدل
تھی بہت تکلیف اب آرام ہے
جب ملا موقع نگاہیں پھیر لیں
شاید اِس کا ہی محبت نام ہے
فائدہ تیری رِفاقت سے نہیں
ہیچ اے دُنیا ترا انجام ہے
ملنے والوں کا مقدّر ہے فراق
قاعدہ یہ مدّتوں سے عام ہے
آنے والوں سے یہاں کہدے کوئی
زندگی تو موت کا پیغام ہے
ہر گھڑی آلام ہر ساعت خوشی
زندگی انورؔ اسی کا نام ہے

ﺻﻠﮯ اہلیہ مرحومہ خورشید بیگم کی تدفین کے بعد کے تاثرات۔

(۷۴)

آرزوئے زندگی میں مر گئے
کرنے کیا آئے تھے ہم کیا کر گئے

اُن کے کوچے میں جو یار و مر گئے
موت کو بھی اپنی زندہ کر گئے

آئے ٹھہرے چلدئے سمجھے نہ کچھ
کس لئے زندہ رہے کیوں مر گئے

زندگی جیسے کہ اک تقریب تھی
آئے کچھ کھایا پیا اور گھر گئے

ڈٹ گئے جو حق کی نصرت کیلئے
وہ ہی کچھ دُنیا سے حاصل کر گئے

بے رُخی کا گر یہی عالم رہا
جان لو بس ہم کہ گویا مر گئے،

بے وفائی ظلم و جور و بے رُخی
خوب یہ الزام میرے سر گئے

ہم غریبوں پر بھی تھی اُن کی نظر
وہ زمانے دُور اے انور گئے

(٧٥)

کہیں تجھ کو بے نہ ڈبوئے ترا زعمِ پارسائی
ترا طنز مجھ پہ ناصح ہے نشانِ خود نمائی

وہی بے رُخی کا عالم وہی اُس کی کج ادائی
مری بے کسی بھی یارو مرے کام کچھ نہ آئی ،

تری دلبری کو کوئی مری حسرتوں سے پُوچھے
مری دشمنی تھی جن سے تری اُن سے آشنائی

وہی شوخی و شرارت وہی ابرو اور مژگاں
وہی مار بے اماں کی وہی تیغ کی صفائی

تری چشمِ نیم وا پر جو بکھر گئے ہیں گیسو ،
درِ میکدہ کھُلا ہے گھٹا میکدہ پہ چھائی

تری آرزو میں جینا تری جستجو میں مَرنا
جو یہ مِل گیا تو سمجھوں مجھے مِل گئی خدائی

کبھی کاش تو بھی سمجھے یہ ستم نہیں تو کیا ہے
مرے دشمنوں سے تیری سرِ بزم ہمنوائی

یہ عجب معاملہ ہے کہ خود اپنا دل ہُوا خوں
جو گلوں کے آنسوؤں پہ کلی کوئی مُسکرائی

مِلے جو بھی اُن سے انورؔ وہ متاعِ زندگی ہے
کہ ہے خلعتوں سے بڑھ کر وہاں خرقۂ گدائی

(۷۶)

شوقِ شراب و بادہ و مستی سے کام ہے
ساقی کا میرے دیکھئے اب فیض عام ہے

ہنگامِ دید شہر میں یہ اِذنِ عام ہے
آجائے میکدے میں جسے شوقِ جام ہے

راتوں کو شور و شر ہے چراغاں ہے بزم میں
یعنی کہ جشنِ مے ہے نشاطِ دوام میں

زینت بھی کوئے یار کی ہے دیدنی کہ آج
دیدار کو ہجومِ خواص و عوام ہے

اُن کی عِنایتوں کا بھلا پوچھنا ہی کیا
اُن کی گلی میں جو بھی گیا شاد کام ہے

دے کر غمِ فراق بڑھایا ہے جذبِ شوق
ناکامیوں کے بعد جنوں شاد کام ہے

مانندِ حُسنِ یار کی ممکن نہیں کہ ہو
وہ حُسن جو کہ غیرتِ ماہِ تمام ہے

ساقی کی بزمِ ناز کی رونق نہ پوچھئے
رخشندہ ہے جو صبح تو تابندہ شام ہے

عینِ ستم ہے دیدۂ بیتاب کے لئے
عُذرِ وفا کہ جس کا تکلّف بھی نام ہے

وہ غیرتِ چمن ہے وہی رُوکشِ بہار
لالہ کہو کہ گُل کہ سمن اُس کا نام ہے

در پردہ اِک پیام ہے خواصانِ بزم کو
یعنی وہ التفات کہ اک رسمِ عام ہے
جیسے کہ رُوبرُو ہے کوئی غیرتِ قمر
انوَر تجلّیوں کا عجب ازدہام ہے

---

(۷۷)

صدق و خلوص و غیرت و ایماں نہیں رہے
دنیا میں جیسے نام کو انساں نہیں رہے
دولت کی حرص میں جو مسلماں ہوئے تھے ہم
دولت نہیں رہی تو مسلماں نہیں رہے
کچھ فکر اے رسولؐ کی امت نہ کل کہیں
دُنیا کہے کہ آج مسلماں نہیں رہے
اچھا کیا کہ آپ نے مجھ کو بھلا دیا،
اچھا ہوا کہ آپ پشیماں نہیں رہے
زاغ و زغن کی تان جو سُن کر ہیں خوش سبھی
بلبل بھی اب چمن میں غزلخواں نہیں رہے

ساقی نے قیدِ غیرت و اخلاص دی اٹھا
جام و سبو بھی لائقِ رنداں نہیں رہے

لذّت وہ جستجوئے مسلسل میں تھی کہ ہم
انوارِ حریصِ جلوۂ جاناں نہیں رہے

(۷۸)

تزئین کے پردے میں عُریاں ہوا جاتا ہے
انسان کو دیکھو تو حیواں ہوا جاتا ہے

کچھ اُن کی توجہ سے کچھ اُن کی عنایت ہے
ہر مرحلۂ ہستی آساں ہوا جاتا ہے

اب ڈوب چکی نبضیں اب دیکھئے لمحوں میں
بیمارِ محبّت کا درماں ہوا جاتا ہے،

تخلیق بھی خالِق کو مشکوک سمجھتی ہے
انسان سمجھ کر بھی ناداں ہوا جاتا ہے

اِس کا بھی ہے اندازہ او ترچھی نظر والے
ٹیڑھا ترے ترکش کا پیکاں ہوا جاتا ہے

لے آئی ہے دُنیا کو تہذیب یہاں تک تو
انسان کا دشمن خود انساں ہوا جاتا ہے
دُنیا کی ترقی سے انورؔ یہ حقیقت ہے
انساں کی ہلاکت کا سامان ہوا جاتا ہے

(۷۹)

کسی کو کسی کی خبر ہی نہیں ہے
کسی پر کسی کی نظر ہی نہیں ہے
مگن ہے ہر اک حال میں اپنے ایسا
کسی دوسرے کی خبر ہی نہیں ہے
نہ ہو جس میں مطلق کبھی احساسِ غیرت
وہ سب کچھ ہے لیکن بشر ہی نہیں ہے
زمانے کو کیا نور بخشے گا جل کر
وہ شعلہ کہ جس میں شرر ہی نہیں ہے
یہ کوتاہئ جذبِ ایماں ہے ورنہ،
دعاؤں میں کیوں اب اثر ہی نہیں ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ بے دین انساں
صَدف ہے کہ جس میں گہر ہی نہیں ہے

خدا جانے انساں کو کیا مِل گیا ہے
خدا کا بھی انساں کو ڈر ہی نہیں ہے

قفس ہو کہ گُلشن برابر ہے اُس کو
جسے ہمّتِ بال و پَر ہی نہیں ہے

فضا ہی کچھ ایسی ہے گُلشن میں انورؔ
کہ نخلِ صَداقت میں بَر ہی نہیں ہے

(۸۰)

اس درجہ محبت میں رُسوا بھی نہ ہو کوئی
جُز میرے زمانے میں چرچا بھی نہ ہو کوئی

کچھ اور تسلی کی صورت ہی نہ ہو دل کو
محبوب مرے تجھ سا یکتا بھی نہ ہو کوئی

تاریکیٔ ہجراں میں سایہ بھی نہیں اپنا
ہم سا شبِ فرقت میں تنہا بھی نہ ہو کوئی

کرتے ہیں علاجِ غمِ الفت میں اطبّاء یوں
مرنے بھی نہ پائے تو اچھا بھی نہ ہو کوئی

کیا خوب ہے خلوت ہے کیا خوب یہ جلوت ہے
دیدار بھی مشکل ہو پردا بھی نہ ہو کوئی ،

مشکل ہو جہاں جینا انساں کیلئے دم بھر
دُنیا میں کہیں ایسی دنیا بھی نہ ہو کوئی

انورؔ یہ تقاضا ہے تکمیلِ محبت کا
دل دے کسی کو خُود اپنا بھی نہ ہو کوئی

---

(۸۱)

اک بُتِ کافر سے ٹکر ہو گئی
دل کی حالت اور ابتر ہو گئی

صُورتِ تصویر وہ دیکھا کئے
انتہا حیرت کی یکسر ہو گئی

اِس چمن میں غنچہ و گُل کے لئے
چاک دامانی مقدّر ہو گئی

سامنے وہ حُسنِ یکتا آ گیا
دفعتاً دُنیا منوّر ہو گئی

اُس بُتِ کافر کی اِک ظالم ادا،
کُل متاعِ قلبِ مُضطر ہو گئی

ارتقا انسانیت کا دیکھنا
زندگی انساں کو دُوبھر ہو گئی

نخوت و شوخیِ شرارت بے رُخی
ہر ادا اُس بُت کی دِلبر ہو گئی

سامنے وہ دفعتاً جب آ گئے
بات کرنا ہم کو دُوبھر ہو گئی

دل لگایا اِک سراپا ناز سے
یہ خطا بھی ہم سے انورؔ ہو گئی

(۸۲)

اک وفا دشمن سے اُلفت ہو گئی
زندگی خود اِک مصیبت ہو گئی

تذکرہ ہے وصل کا یارو فضول
ہجر کی عادی طبیعت ہو گئی

اُس کے رُخ سے جب ذرا سرکی نقاب
ختم سب ناصح کی حُجّت ہو گئی

اُس نے کیا دیکھا کہ بس اِک آن میں
اور ہی کچھ دِل کی حالت ہو گئی

دل سے مِٹتا ہی نہیں اُن کا خیال
اُن سے کچھ ایسی محبّت ہو گئی

آج ہے انسانیت انساں پہ بار
آج یہ انساں کی قسمت ہوگئی

آدمی جتنے بڑھے تعداد میں،
اُتنی ہی کم آدمیت ہوگئی،

جھوٹ ہے اب کامیابی کی اساس
سچ کچھ ایسی بے صداقت ہوگئی

عقل پر غالب ہوئے حرص و ہوس
دل پہ شیطاں کی حکومت ہوگئی

(۸۳)

اَب نہ دلبر نہ ستمگر نہ حسیں ہے کوئی
اپنا محبوب زمانے میں نہیں ہے کوئی

حُسن خود منتظرِ اہلِ نظر ہے لیکن
بزم میں اہلِ نظر آج نہیں ہے کوئی

جب بھی دیکھو تو نہیں کوئی نظر کے آگے
جب بھی سوچو تو رگِ جاں کے قریں ہے کوئی

دل بہت مضطرب دید ہے یارو اَب تو
کوئی بتلائے کہ پوشیدہ کہیں ہے کوئی

یوں تو احساس کی دُنیا پہ ہے چھایا ہر دم
ویسے جس سمت بھی دیکھو تو نہیں ہے کوئی

عقل جس جا بھی ہوئی اُس کی طلب سے مایوس
میرا احساس مُصر ہے کہ وہیں ہے کوئی

یُوں تو ڈھونڈ آئے سب ہی دیر و حرم میں انورؔ
غور سے دیکھو تو موجود یہیں ہے کوئی

(۸۴)

یار جس وقت بھی پہلو کے قریں ہوتا ہے
وہی لمحہ تو حقیقت میں حسیں ہوتا ہے

عشق ہوتا ہے جہاں اُسکی طلب میں بے چین
حُسن پوشیدہ حقیقت میں وہیں ہوتا ہے

حُسن خود عشق طلب ہے مگر اِس کا اکثر
حُسن والوں کو بھی احساس نہیں ہوتا ہے

یوں تو ہر ایک ادا حُسن کی دلکش ہے مگر
حُسنِ برہم تو قیامت کا حسیں ہوتا ہے

حُسن پر چھاتا ہے جس وقت جوانی کا نشہ
خود کہیں ہوتا ہے اور دھیان کہیں ہوتا ہے

خود فریبی ہے ہمیں اُس سے وفا کی اُمید
با وفا کب کوئی ماہ جبیں ہوتا ہے

جان بھی دے دو وفا میں تو وفا کا انور
کب کسی حُسنِ ستمگر کو یقین ہوتا ہے

(۸۵)

اک حُسنِ ستمگر سے انور اظہارِ محبّت کر بیٹھے
ہم اپنے ہی دِل سے بے سمجھے یوں آپ عداوت کر بیٹھے

وہ مستِ شرابِ ناز سہی وہ محوِ غرورِ حُسن سہی
دراصل خطا یہ اپنی ہے کیوں اُن سے محبّت کر بیٹھے

طعنوں کے سوا اِس دُنیا کے بس کی تو کوئی بات نہ تھی
کیوں اتنی ذرا سی بات پہ تم انکارِ محبّت کر بیٹھے

ہنگامِ تجلّیِ مطلق بھی انجام کا اپنے ہوش نہ تھا
ہم عشق کے دھوکے میں یارو خود درد کی چاہت کر بیٹھے

میں خود ہی جو کچھ کہتا تو کبھی بات نہ پوری سی ہوتی
اچھا یہ ہوا کہ خود وہ ہی آغازِ شکایت کر بیٹھے،

(۸۶)

زُلف لہرا کے رُخِ یار پہ منڈلائی ہے
بدلی جیسے سرِ میخانہ اُمنڈ آئی ہے

چشمِ ساقی سے چھلکتی ہے شرابِ گلرنگ
آج محفل میں جدھر دیکھئے رعنائی ہے

کون آیا ہے پسِ پردۂ حسنِ گلشن
کس کی خاطر یہ دمِ صبح گُل آرائی ہے

لالہ و گُل ہی نہیں مہر و مہ و انجم نے
فکرِ انساں کی تجلّی سے ضیا پائی ہے

جذبِ صادق ہو تو ہے عشق ہر اک جا کامل
ورنہ بے کار یہ سب بادیہ پیمائی ہے

زینتِ گُل پہ ہے خود دیدۂ گل کو حیرت
جس کا جلوہ ہے یہاں وہ ہی تماشائی ہے

دفعتاً آج مجھے دیکھ کے چُپ ہیں انور
بات کوئی اُنہیں بھُولی ہوئی یاد آئی ہے

(۸۷)

یہ کس نے سامنے لاکر شرابِ ارغواں رکھ دی
کہ خود توبہ نے میری بڑھ کے ساغر پر زباں رکھ دی

جہاں جس جا کسی نے جب بھی کی چشمِ کرم ہم پر
وہیں گھبرا کے ہم نے بھی جبیں بس بے گماں رکھ دی

بہت نازک ہے شاخِ آرزو گلزارِ ہستی میں
غضب ہے ہم نے خود اس پر بنائے آشیاں رکھ دی

اُٹھائی اور جھکا بھی لی بس اِک پل میں نظر اپنی
چلا کر تیر اک ظالم نے چیکے سے کماں رکھ دی

بس اک حسنِ عمل کے واسطے خالق نے اے انور
اجل کی زد میں کچھ دن کو حیاتِ جاوداں رکھ دی

(۸۸)

کس کے قدم حریمِ رگِ جاں میں آگئے
جلوے تمام کلبۂ احزاں میں آگئے

اُف یہ غضب کہ آج اُٹھائے ہوئے نقاب
وہ دفعتاً ہی محفلِ رنداں میں آگئے

اللہ رے خیال کہ دیکھا کیا اُنہیں
جیسے کہ ہُو بہو وہ گلستاں میں آگئے

وحشت سکوت یاس و الم صدمۂ فراق
کیا کیا رفیق دل کے بیاباں میں آگئے

بُغض و عناد و کینہ و مکر و ہوا و حِرص
ابلیس کتنے پیکرِ انساں میں آ گئے

جن کی ہر اک ادا پہ ہے خود لامکاں کو ناز
ایسے بھی لوگ عالمِ امکاں میں آ گئے

انور بچے جو حلقہ زلف دوتا سے ہم
دامِ فریب گردشِ دوراں میں آ گئے

(۸۹)

جوشِ جنوں میں چاکِ گریباں لیے ہوئے
وحشت میں پھر رہا ہوں بیاباں لیے ہوئے

بربادئ تمام ہے سامانِ صد بہار
گُل ہیں یونہی تو چاکِ گریباں لیے ہوئے

شمعِ جمالِ حُسن پسِ ابرِ زُلفِ سیاہ
آتا ہے شب میں کوئی چراغاں لیے ہوئے

بجلی گرے کہ ہوش اُڑے اب رہے نصیب
جاتے ہیں آج ہم بھی دل و جاں لیے ہوئے

ہر شے فروغِ حسن میں گُم ہو کے رہ گئی

ذوقِ جمالِ زلف پریشاں لئے ہوئے

مجبوریٔ تمام اے انور خدا گواہ

دل گھُٹ رہا ہے وسعتِ ارماں لئے ہوئے

(۹۰)

کسی سے قصۂ شام و سحر کہنا ہی پڑتا ہے
ہمیں حالِ دلِ آشفتہ سر کہنا ہی پڑتا ہے

نکل آتے ہیں بے حد ضبط کرنے پر بھی جب آنسو
مریضِ غم کو رازِ چشمِ تر کہنا ہی پڑتا ہے

وہ کب اوروں کو دیکھے جس نے دیکھا تجھ کو بے پردہ
ترے جلووں کو معراجِ نظر کہنا ہی پڑتا ہے

حجابِ شب تری زلفوں سے جب تعبیر کرتا ہوں
ترے رُخ کو بھی پھر رشکِ قمر کہنا ہی پڑتا ہے

تپش سوزِ محبت کی جب انورؔ حد سے بڑھتی ہے
چُھپائیں لاکھ رازِ غم مگر کہنا ہی پڑتا ہے

(۹۱)

آمد آمد اُس بُتِ سیمیں کی میخانے میں ہے
جگمگا اٹھا ہے شیشہ نور پیمانے میں ہے

ڈبڈبا آئے ہیں اُن مغرور آنکھوں میں بھی اشک
اللہ اللہ کس قدر تاثیر مرجانے میں ہے

مے کشی شیوہ نہیں پر اس لئے پیتا ہوں میں
جام وہ خود دے رہے ہیں دَور میخانے میں ہے

آگیا ہے جگمگانے کون ظلمت گاہ کو،
اِس بھیانک رات میں بھی نور کاشانے میں ہے

ہوگیا چُپ چاپ جل کر شمع کے اُوپر فدا
عشق کا جذبہ اگر پُوچھو تو پروانے میں ہے

اب نہ دے مجھ کو صلائے شادمانی ہم نشیں
عشق بازی کا مزہ گھٹ گھٹ کے مر جانے میں ہے

ہو گیا ہر ایک افسردہ سا سُن کر رات کو
کس بلا کا سوز انورؔ تیرے افسانے میں ہے

(۹۲)

بڑھا حسد سے دردِ جگر چاہتا ہے
جنوں پھر فریبِ نظر چاہتا ہے

ذرا صاحبِ درد تھا میں دلوں کو
وہ آہوں میں میری اثر چاہتا ہے

توجہ سے دُنیا کی مطلب نہیں ہے
مرا دل تو تیری نظر چاہتا ہے

ترے رُخ پہ گیسو پریشاں ہوئے ہیں
گھٹاؤں میں چھُپنا قمر چاہتا ہے

مٹانا تو ہستی کو مشکل نہیں ہے
مگر جیسے وہ فتنہ گر چاہتا ہے

مُرادوں کا حاصِل مبارک ہو انورؔ
اب آیا وہ رشکِ قمر چاہتا ہے

(۹۳)

عجب کیف پرور تری جستجو ہے
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تو ہے

ترے بن بھلا کیا خوشی عید کی ہو
مری تو خوشی میں خوشی ایک تو ہے

ذرا اپنی زلفوں کو کر دے پریشاں
کہ ٹھنڈی ہے محفل تو غائب سبُو ہے

زمانے میں ہر سمت جلوے ہیں تیرے
تجھی سے تو یہ عالمِ رنگ و بُو ہے

اٹھا دے نقاب اپنے رُوئے حسیں سے
ہے بے نور عالم اَلَم کُو بکُو ہے

گئے ہیں وہ جس دن سے ناراض ہو کر
جگر پارہ پارہ ہے دِل بے لہو ہے
وہ آجائیں انورؔ تو ممکن سکوں ہو
دگرنہ کسے زیست کی آرزو ہے

(۹۴)

کبھی مائل کسی پر خود طبیعت ہو ہی جاتی ہے
محبت کی نہیں جاتی محبت ہو ہی جاتی ہے

میں جب بھی یاد کر لیتا ہوں آ گے آ ہی جاتے ہیں
ہجومِ غم میں اُن کی یہ عنایت ہو ہی جاتی ہے

نہ پوچھو کس لئے ہے آج یہ حالِ زبوں میرا
وہ جب بھی یاد آتے ہیں یہ حالت ہو ہی جاتی ہے

ذرا جو دیکھ لیتا ہوں نظر بھر کے رُخِ انورؔ
بفرطِ رنج حاصل مجھ کو راحت ہو ہی جاتی ہے

(۹۵)

حُسن دُنیا میں کسی کو جو خُدا دیتا ہے
ظُلم کرنے کے بھی انداز سکھا دیتا ہے

حُسن کو عشوہ و انداز و ادا دیتا ہے
جو بھی دیتا ہے بہت موثر بادیتا ہے

حُسن دیتا ہے اُسے خُوئے جفا دیتا ہے
اک بُتِ ناز کو کیا کیا نہ خُدا دیتا ہے

حُسن کی شمع جو ہوتی ہے فروزاں اے دل
عشق پروانہ خود اپنے کو بنا دیتا ہے

یہ الگ بات کہ اِنکار کئے ہی جاؤ
ورنہ انداز تو اُلفت کا پتا دیتا ہے

بزم میں حالِ شکستہ ترے دیوانے کا
دل کی ہر بات خموشی سے بتا دیتا ہے

جس کو ہر ایک سمجھتا ہے بقا کا باعث
ہے وہی سانس جو پیغامِ فنا دیتا ہے

مطمئن ہو نہ خموشی پہ ہماری کوئی
چپ زباں ہو تو ہر اک زخم صدا دیتا ہے

لذتِ عشق عجب چیز ہے انور بسمل
زخم کھاتا ہے تو قاتل کو دعا دیتا ہے

(۹۶)

رُت جو برسات کی آئے تو غزل ہوتی ہے
جب گھٹا زُلف کی چھائے تو غزل ہوتی ہے

چشمِ ساقی میں مچلتی ہوئی صہبائے نشاط
دل کے پیمانے میں آئے تو غزل ہوتی ہے

حُسن کے بادۂ لبریز میں ہنگامِ شباب
زندگی ڈوب ہی جائے تو غزل ہوتی ہے

جب گھٹا چھائے زمانے میں فضا ہو پُرکیف
ایسا موسم کوئی آئے تو غزل ہوتی ہے

پھر یقیں اپنی محبّت کا دلانے کے لئے
وہ قسم اپنی جو کھائے تو غزل ہوتی ہے

چوٹ کھا کر کسی معصوم نظر کی انور
جامِ دل ٹوٹ ہی جائے تو غزل ہوتی ہے

(۹۷)

مسجد بھی سامنے ہے نزدیک میکدہ ہے
دلچسپ کتنا یارب تُو نے یہ گھر دیا ہے

اظہارِ ناخوشی پر دل اور خوش ہوا ہے
برہم جو تم ہوئے تو کچھ حُسن بڑھ گیا ہے،

ویسے تو مَے میں ساقی لذّت بھی کیف بھی ہے
تُو بھر کے جام دے تو کچھ اور ہی مزا ہے

پایا جو تم کو ہم نے دونوں جہان کو پایا
کھویا تو گویا ہم نے خود کو بھی کھو دیا ہے

الفت میں آخرش یہ منزل بھی آگئی ہے
دل مجھ سے آج اپنا انجام پوچھتا ہے
کچھ اس ادا سے دیکھا اُس نے کہ دیکھتے ہی
انورؔ کی زندگی کا نقشہ بدل گیا ہے

؎ فلیٹ نمبر ۲ ماما بلڈنگ ٹمپل روڈ کراچی جس میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۷ء تک قیام رہا اس کے قریب دو مساجد اور دو ہی شراب خانے تھے۔

(۹۸)

جلوہ گر ہر شے میں تیرا حُسنِ عالمگیر ہے
تجھ سے قائم دو جہاں میں حُسن کی تنویر ہے

پُوچھتے کیا ہو مآلِ لذّتِ عشقِ بُتاں
آہِ دل، دردِ جگر، اور نالۂ شب گیر ہے

دل کو زخمی کر گئی ہے اُن کی چشمِ نیم باز
اور کیا ہے قید جس نے زُلف کی زنجیر ہے

ہو چکی مدّت مگر عالم وہی ہے درد کا
اک نظر کی اور یہ اللہ رے تاثیر ہے

جو بھی زد پر آ گیا اُن کے وہ زخمی ہو گیا
ہے اگر ابرو کماں تو ہر مژہ اک تیر ہے

دیکھتے ہی مجھ کو انور وہ جھکا لیتے ہیں سر
اُن کو بربادی پہ میری شرم دامن گیر ہے

(۹۹)

دیکھنے والے ذرا یہ بھی تو منظر دیکھتے
میں تڑپتا زیرِ خنجر آپ ہنس کر دیکھتے

آہ جن نظروں سے بسمل تم نے دل کو کر دیا
کاش اُن نظروں سے وقتِ مرگ آ کر دیکھتے

آتشِ رشک و حسد میں جل رہا تھا پھول پھول
دیکھنے والے تمہیں گلشن میں آ کر دیکھتے

آہ و فریاد و فغاں ہم نے نہ کی اچھا ہوا
ورنہ تم کچھ اور ہی دُنیا کا منظر دیکھتے

آرزو بس ایک دل میں اپنے انور رہ گئی
وقتِ آخر کاش اُن کا رُوئے انور دیکھتے

(۱۰۰)

ساغرِ مئے غمِ ہستی کا بدل ہوجائے
مرے ساقی مری مشکل بھی تو حل ہوجائے

جام ے گا نہ کوئی رند یہ توہینِ جنوں
آج یہ فیصلہ رندوں کا اٹل ہوجائے

آپ کو شک ہے وفا پر تو اٹھائیں خنجر
آج ثابت مرا پیمانِ ازل ہوجائے

آپ کے حسن پہ دنیا کو تذبذب ہے ابھی
پردہ اٹھے تو معمہ ابھی حل ہوجائے

آج پھر مست گھٹا جھوم کے اٹھی انورؔ
آج تو پھر کوئی اچھی سی غزل ہوجائے

۱۰۱

یہ خنک ہوا کے جھونکے یہ حسیں گلوں کے سائے
بھلا ایسی ساعتوں میں کوئی یاد کیوں نہ آئے

جو ادا ہے کافرانہ جو نظر ہے قاتلانہ
کوئی کیا کرے پھر آخر جو نثار ہو نہ جائے

رہِ عشق پُرخطر ہے یہاں جان کا بھی ڈر ہے
جسے زندگی ہو پیاری مرے ساتھ وہ نہ آئے

جو ادائے بے رُخی پر یہ زمانہ مر مٹا ہے
کسے کیا خبر کہ کیا ہو جو وہ پیار سے بُلائے

تری بے رُخی نے ظالم وہ بجھا کے رکھ دیئے سب
جو چراغِ آرزو بھی مرے دل میں جگمگائے

یہ ہے شومئِ مقدّر کہ بدل گیا زمانہ

جنہیں جانتے تھے اپنا وہی ہو گئے پرائے

وہ خفا ہوئے تو انور ہوا چار سُو اندھیرا

ہوئی روشنی سراسر وہ ذرا جو مسکرائے

نظمیں

فہرست

۱۔ آمد
۲۔ اب جو آئے تو قیامت ہوگی
۳۔ دیس
۴۔ وہ قوم نہ کافر نہ مسلمان ہے یارو
۵۔ آہ اے خورشید
۶۔ پھول
۷۔ وہ بچیّاں
۸۔ بنیاد
۹۔ چیلنج
۱۰۔ چھیڑ اچھی نہیں ہوتی کسی دیوانے سے
۱۱۔ کالج میں پہلا دن
۱۲۔ پلا دے پلا دے پلا دینا ساقی
۱۳۔ جانِ بہار
۱۴۔ ساون کے دن
۱۵۔ سہرا
۱۶۔ رخصتی
۱۷۔ سہرا

آمد

جانِ جاں جانِ جہاں آنے کو ہے
آرزوئے عاشقاں آنے کو ہے
صدرِ بزمِ گُل رُخاں آنے کو ہے
تاجدارِ مہ وشاں آنے کو ہے
آج رشکِ دلبراں آنے کو ہے

اس کو دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے
حُسن کے انوار میں کھو جائیں گے،
سب اُسی کے دیکھنا ہو جائیں گے
وہ جو سب کا مہرباں آنے کو ہے
آج رشکِ دلبراں آنے کو ہے

اُس کے دم سے روشنیِ عالم میں ہے
برگ و گل پر تازگی عالم میں ہے
وہ سراپا زندگی عالم میں ہے
وہ نشاطِ روح و جاں آنے کو ہے
آج رشکِ دلبراں آنے کو ہے

وہ جو آئیں گے تو رونق چھائے گی
اُن کی آمد زندگی بن جائے گی
ہر کلی بے ساختہ کھِل جائے گی
وہ بہارِ جاوداں آنے کو ہے
آج رشکِ دلبراں آنے کو ہے

اب جو آئے تو قیامت ہوگی

اب جو دیکھا تو مصیبت ہوگی — دل میں افزونیٔ اُلفت ہوگی
زندگی وقفِ محبت ہوگی — بات بڑھ جائیگی زحمت ہوگی

اب جو آئے تو قیامت ہوگی

اب جو پایا تو مچل جائے گا — شعلۂ حُسن پہ جل جائے گا
اُن کو دیکھا تو بہل جائے گا — پر نہ دل کو کبھی راحت ہوگی

اب جو آئے تو قیامت ہوگی

جذبۂ عشق فزوں تر ہوگا — جلوۂ یار میسّر ہوگا
دل میں ہنگامۂ محشر ہوگا — چشم محوِ قد و قامت ہوگی

اب جو آئے تو قیامت ہوگی

اک ذرا دیر کو آ جائیں گے شعلۂ عشق جلا جائیں گے
دل کو دیوانہ بنا جائیں گے پھر وہی ہم وہی فرقت ہوگی

اب جو آئے تو قیامت ہوگی

اُن کی آنکھوں سے بہیں گے یارو اُن کی چاہت میں جئیں گے یارو
چاکِ داماں نہ سئیں گے یارو وہ جو دیکھیں گے ندامت ہوگی

اب جو آئے تو قیامت ہوگی

وہ اگر سامنے آئے انور حسن چھا جائیگا اس عالم پر
محو ہو جائیگی جلوؤں میں نظر دل کی کچھ اور ہی حالت ہوگی

اب جو آئے تو قیامت ہوگی

دیس

وہ دیس نہ تیرا ہے نہ میرا ہمدم

جس دیس میں غیرت نہ حیا ہے باقی
جس دیس میں الفت نہ وفا ہے باقی
جس دیس میں نیکی نہ جزا ہے باقی
جس دیس میں انساں نہ رہا ہے باقی

وہ دیس نہ تیرا ہے نہ میرا ہمدم

جس دیس میں اُڑتا ہے شرافت کا مذاق
جس دیس میں بن جاتا ہے عزت کا مذاق
جس دیس میں پیدا ہوا ذلت کا مذاق

جس دیس میں آسان ہے غیرت کا مذاق

وہ دیس نہ تیرا ہے نہ میرا ہمدم

جس دیس میں راحت نہیں حاصل دل کو

جس دیس میں جینا ہوا مشکل دل کو

جس دیس میں دل کرتے ہیں گھائل دل کو

جس دیس میں خود دل بھی ہے دشمن دل کو

وہ دیس نہ تیرا ہے نہ میرا ہمدم

جس دیس میں نفرت ہے وفا سے بڑھ کر

جس دیس میں ذلّت ہے حیا سے بڑھ کر

جس دیس میں ظلمت ہے ضیا سے بڑھ کر

جس دیس میں دولت ہے خدا سے بڑھ کر

وہ دیس نہ تیرا ہے نہ میرا ہمدم

وہ قوم نہ کافر نہ مسلمان ہے یارو

جس قوم میں اخلاق نہ آداب نہ غیرت
جس قوم میں اخلاص نہ احسان نہ اُلفت
جس قوم میں ایمان نہ ایقان نہ وحدت
جس قوم میں انصاف نہ احساس نہ عزّت
وہ قوم نہ کافر نہ مسلمان ہے یارو
جس قوم میں تہذیب نہ تنظیم نہ تکریم
جس قوم میں مفقود ہو اچھائی کی تفہیم
جس قوم میں بیہودگی ہو حاصلِ تنظیم
جس قوم کا مقصود ہو بس عیش کی تعلیم
وہ قوم نہ کافر نہ مسلمان ہے یارو

جس قوم میں غنڈوں کو امامت ہو میسّر
جس قوم میں رندوں کو ولایت ہو میسّر
جس قوم میں شہدوں کو خلافت ہو میسّر
جس قوم میں مستوں کو عدالت ہو میسّر
وہ قوم نہ کافر نہ مسلمان ہے یارو

جس قوم میں جاہل کو ملے دادِ فضیلت
جس قوم میں اللّٰہ کو بھی حاصل ہو حکومت
جس قوم میں ہو ظلم کے ہاتھوں میں عدالت
جس قوم میں ظالم کی ہر اک بات ہو حُجّت
وہ قوم نہ کافر نہ مسلمان ہے یارو

آہ اے خورشید

(اہلیہ مرحومہ خورشید بیگم کی میت دیکھکر)

آہ اے خورشید تجھ کو کیا ہُوا
کس لئے خاموش ہے کچھ تو بتا

کم ہوا وہ درد جو پہلو میں تھا
کچھ تو کہہ کیسی طبیعت ہے تری

اور رہا اب ضعف کا عالم ہے کیا
درد میں محسوس ہوتی ہے کمی

کچھ سکوں تکلیف سے حاصل ہوا
کیا دوا نے کچھ دکھایا ہے اثر

اس خموشی کا ہے آخر راز کیا
اُف خموشی اسقدر ہے کس لئے

یہ خموشی باعثِ تشویش ہے
اِس خموشی پر گماں ہے موت کا

عالمِ امکاں میں تمامِ زندگی
موت یعنی اختتامِ زندگی

موت آغازِ حیاتِ جاوداں — موت روحِ شادکامِ زندگی،
موت چھٹکارا غم و آلام سے — موت تسکینِ دوامِ زندگی
زندگی بنتی ہے جب پیغامِ موت — موت دیتی ہے پیامِ زندگی

موت نے آغوش میں تجھ کو لیا
تھک چکا جب تیز گامِ زندگی

موت سے تجھ کو نئی دنیا ملی، — جس میں راحت ہے سرا پا زندگی
زندگی وہ جس میں غم مطلق نہیں — زندگی وہ جس میں ہر ساعت خوشی
زندگی وہ جس میں بیماری نہ دکھ — زندگی وہ جس میں راحت ہر گھڑی
جس میں بغض و کینہ و نفرت نہیں — جس میں رنجش ہے نہ مطلق دشمنی
حرص ہے جس میں نہ ہے رشک و حسد — جس میں کل اخلاص کامل دوستی

اجر میں صبر و ثبات و شکر کے
تجھ کو اک ایسی بھی دنیا مل گئی

موت کی آغوش میں جا کر رہی خوش
اک حیاتِ جاوداں پا کر رہی خوش

زندگی نے تجھ کو بے حد غم دیا
زندگی کو آج ٹھکرا کر ہے خوش

لیکن اے ہمرازِ دردِ دل بتا
کس لئے تو ہم کو تڑپا کر رہی خوش

گھر میں ہے چاروں طرف آہ و بکا
رو رہا ہے دیکھ ہر چھوٹا بڑا،

جو بھی آیا ہے شریکِ درد ہے
جس کو دیکھو غم میں ہے ڈوبا ہوا

دوسروں کو کیا بھلا تسکین دیں
خود ہمیں یارا نہیں ہے صبر کا

اور اس آہ و بکا کے باوجود
تجھ پہ ہے کامل سکوں چھایا ہوا

تجھ کو احساسِ مروت بھی نہیں
کچھ خیالِ عہدِ الفت بھی نہیں

یک بہ یک تیری بے نیازی بے رخی،
جانتے ہیں تیری عادت بھی نہیں

کچھ نہ کچھ اس کا سبب بھی ہے ضرور
بات یہ کچھ بے حقیقت بھی نہیں

رنج و غم کا کچھ مداوا ہی نہ تھا لاکھ چاہا کم نہ تیرا دکھ ہوا
رائیگاں سب کوششیں ہوتی گئیں دکھ ترا دن رات بڑھتا ہی گیا
چارہ گر مایوس ہو کر رہ گئے ڈر رہے تھے جس سے وہ دن آ گیا
سارے دکھ تکلیف مٹ کر رہ گئے
آن واحد میں یہ کیا کچھ ہو گیا

جانے والے تجھ پہ رحمت ہو مدام ہو وہاں خلد بریں تیرا مقام
قبر میں ہو چین سے سونا نصیب اور تو ہو حشر کے دن شادکام
عین ممکن ہے ملیں ہم حشر میں
پھر وہی صبح اور وہی اپنی ہو شام

اِنتظار اُس دن کا کرنا ہے ہمیں، آہ تیرے غم میں مرنا ہے ہمیں
بھول جائیں تجھ کو یہ ممکن نہیں ہاں مگر اب صبر کرنا ہے ہمیں

صبر میں حد سے گذر جائیں گے ہم
دل جو گھبرایا تو مر جائیں گے ہم

پھُول

کچھ پھُول مجھ کو پیار کے اے گلفروش دے

نذرانہ جن کو پیار کا اپنے بناؤں میں
لوحِ مزارِ یار پہ جا کر چڑھاؤں میں
گلہائے نو بہ نو کو سجا کر دمِ سحر
تُربت کو اپنے یار کی گلشن بناؤں میں

کچھ پھُول مجھ کو پیار کے اے گلفروش دے

ہر پھُول میں ہو پیار کی رنگت بھری ہوئی
گلہائے نوبہار کی خوشبو بسی ہوئی

عشقِ جمالِ یار میں مُطلق رَچی ہوئی
سرتا بہ پا ہر ایک کلی دل بنی ہوئی
کچھ پھُول مجھ کو پیار کے اے گلفروش دے

پھُولوں کے ساتھ نکہتِ بادِ صبا بھی ہو
موجِ نسیمِ عشق و شمیمِ وفا بھی ہو
لالے کا خُون اُس میں برنگِ حنا بھی ہو
سوزِ صدائے بُلبُلِ رنگیں نوا بھی ہو
کچھ پھُول مجھ کو پیار کے اے گلفروش دے

سوز و گدازِ قلبِ پپیہا بھی چاہیئے
اور انتظارِ نرگسِ شہلا بھی چاہیئے
داغِ فراقِ سینۂ لالہ بھی چاہیئے
اور اضطراب میرے جگر کا بھی چاہیئے

کچھ پھول مجھ کو پیار کے اے گلفروش دے

خورشید کی کرن بھی ستاروں کے ساتھ ہو
آغوش میں لیے ہو ہر اک گُل قمر کی ضو
ہر پھول آب و تاب میں موتی کی مثل ہو
روشن لحد ہو یار کی جس سے بہ طرزِ نو
کچھ پھول مجھ کو پیار کے اے گلفروش دے

چادر بنا دے ایسی بھی گلہائے ناز کی،
ہوں جس میں میری حسرت و ارماں کے تار بھی
جھالر لگی ہو دیدۂ انور کے اشک کی۔
چادر ہو دلکشی میں بہر حال دیدنی
لوحِ مزارِ یار پہ جا کر چڑھاؤں میں،
تُربت کو اپنے یار کی گلشن بناؤں میں

وہ بچیاں

(چند ٹیڈی بچیوں کو دیکھ کر)

بچیاں وہ جو پری زاد بنی پھرتی ہیں
ان کا وارث ہے نہ والی نہ نگہباں کوئی

ان میں احساس ہی غیرت کا نہ عزت کا خیال
ان میں دیکھو تو نہیں نام کو انساں کوئی

ان کو تعلیم ملی ہے کہ جیا ہے جب تک
پورا ہونے کا نہیں زیست کا ارماں کوئی

ان کو ہر قید شرافت سے بنا کر آزاد
خود بھی ہوتا تو کبھی ہو گا پشیماں کوئی

ان کی گودوں میں کل اک قوم ہے پلنے والی
یہ بھی سوچے تو ذرا آج کا انساں کوئی

بُنیاد

دولت نہ تموّل نہ حکومت نہ تجمّل
عقبیٰ کی مسرّت ہے بس ایمان کی بُنیاد

بے شُبہ اطاعت ہی رسولِ عربیؐ کی
قرآن کی رُو سے ہے مسلمان کی بُنیاد

کچھ وضع نہ ملبوس نہ آدابِ مجالس
غیرت ہے بس اک نقطہ انسان کی بُنیاد

ناسُور ہے وہ شخص جماعت کے بدن میں
بنتا ہے جو ہر فتنہ و طغیان کی بنیاد

سمجھیں نہ غلط آپ خموشی تو کسی کی
بنتی ہے خموشی کبھی طوفان کی بُنیاد

وہ علم جو بے دین مسلماں کو بنا دے
وہ علم حقیقت میں ہے شیطان کی بنیاد

کچھ اس میں نہیں دخل ذرا وہم و گماں کو
اسلام میں ہے عقل ہی ایمان کی بنیاد

مقصود نہ ایجاد نہ سائنس ہے انورؔ
مومن کے لئے چاہیئے قرآن کی بنیاد

چیلنج

اخلاق کو چیلنج ہے ایمان کو چیلنج
یہ دورِ سراسر ہے مسلمان کو چیلنج

ہے کوئی براہیمؑ جو توڑے انہیں بڑھ کر
اصنام ہیں سائنس کے انسان کو چیلنج

تاویل کی ہر بات شریعت میں نبیؐ کی
اللہ کو چیلنج ہے قرآن کو چیلنج

جو شکل بھی طاعت سے ہو انکار کی اے دوست
ہے دین میں اللہ کے فرمان کو چیلنج

کس چیز نے غافل تجھے عقبیٰ سے کیا ہے
ہر سانس تو انورؔ ہے تری جان کو چیلنج

چھیڑ اچھی نہیں ہوتی کسی دیوانے سے

جو میسّر نہیں آتی کسی میخانے سے
اِس نے پی لی نگہِ مست کے پیمانے سے
اِسکو مطلب ہے نہ اپنے سے نہ بیگانے سے
فائدہ کچھ نہیں زاہد ترے سمجھانے سے

چھیڑ اچھی نہیں ہوتی کسی دیوانے سے

تجھ کو پہنچے کوئی نقصان نہ کہنا ہم سے
تُو ہو ثابت وہاں انجان نہ کہنا ہم سے
ہو اگر آپ پشیمان نہ کہنا ہم سے
لُٹ کے آئے نہ کہیں زاہد ضم خانے سے

چھیڑ اچھی نہیں ہوتی کسی دیوانے سے

اس کی محفل میں نہیں سُود و زیاں کی باتیں
بیش کا ذکر نہ ہیں آہ و فغاں کی باتیں
اس کی باتیں ہیں فقط عشقِ بُتاں کی باتیں
اس کو مطلب ہے فقط شیشے سے پیمانے سے
چھیڑ اچھی نہیں ہوتی کسی دیوانے سے

چشمِ مخمور سے آنکھیں نہ ملانا زاہد
خیر واں اپنے تقدّس کی منانا زاہد
مے کے چھینٹوں سے قبا اپنی بچانا زاہد
بچنا محفل میں چھلکتے ہوئے پیمانے سے
چھیڑ اچھی نہیں ہوتی کسی دیوانے سے

دِل کو مستِ مئے پُرجوش بنا دیتے ہیں
جو بھی آجاتا ہے مدہوش بنا دیتے ہیں
بے پیئے بھی وہاں مئے نوش بنا دیتے ہیں
بچکے ممکن نہیں آنا کِسی خُمخانے سے
چھیڑ اچھی نہیں ہوتی کِسی دیوانے سی

کالج میں پہلا دِن

وہ دن جو ہے نوروز کالج میں اکثر
کہ آتا ہے ہر سال خوشیاں ہی لے کر
ملاتا ہے مدّت کے بچھڑے ہوؤں کو
بڑھاتا ہے کالج کی رنگینیوں کو
بصد شوق پہنچا خراماں خراماں
میں کالج میں لیکن پریشاں پریشاں
سُنے تھے جو کالج کے اعجاز دیکھے
جوانوں کے دلچسپ انداز دیکھے
کوئی کوٹ پتلون میں ملبوس آیا
کوئی سادہ کپڑوں میں تھا بھایا بھایا

جوانی کی بَدمست اُمنگوں کو لے کر
وہ ملتے تھے آپس میں بیتاب ہوکر
ہر اِک شے پہ چھائی ہوئی بیخودی تھی
فضا ساری الفت میں ڈوبی ہوئی تھی
نگاہیں جو اُٹھیں یکایک تو انور
نظر آیا اِک اور پُر کیف منظر
چمن میں درختوں کی چھاؤں کے نیچے
جوانی کی رنگین گھٹاؤں کے نیچے
حسین ڈالیوں پر گلوں کے قریں تر
لچکتے ہوئے سبز پتوں کے اندر
نظر آئیں کالج کی شیریں نوائیں
بہ چشمِ تلطف بہ طُرفہ ادائیں

پریشان زلفیں حسیں گردنوں پر
کہ جیسے اندھیرے میں مینا و ساغر
وہ پُرشوق نظریں جھجکتے اشارے
وہ اٹھتی جوانی بھڑکتے شرارے
محبت کی دُنیا میں ہلچل مچادی
بس آتے ہی اِک آگ ہر سُو لگادی

نوٹ: یہ اور اس کے بعد کی تین نظمیں زنانہ کالج کی یادگار ہیں۔

پلادے پلادے پلادینا ساقی

یہ رنگین ساغر یہ پُرنور بوتل،
یہ ساون کی راتیں یہ بدمست بادل
تقاضا ہے دل کا یہی اب مسلسل
پلادے پلادے پلادینا ساقی

یہ پھولوں کی قسمت جوانی کا عالم
یہ بلبل کی رنگیں بیانی کا عالم
یہ شبنم پہ صبح جوانی کا عالم
پلادے پلادے پلادینا ساقی

پریشان زلفیں یہ کالی گھٹائیں
یہ معصوم نظریں یہ قاتل ادائیں

یہ پر کیف موسم یہ رنگیں فضائیں
پلادے پلادے پلا دینا ساقی
نہیں مجھ کو مینا و ساغر کی حاجت
پلادے نظر سے شرابِ محبّت
نہیں اس میں رائے کی میری ضرورت
پلادے پلادے پلا دینا ساقی
مزہ جب ہے ہونٹوں سے اپنے لگا کر
نظر سے بھی تھوڑی سی اِس میں گرا کر
محبّت سے بھرپور ساغر اٹھا کر
پلادے پلادے پلا دینا ساقی
محبت میں کیا دین کا ہے کا ایماں

اٹھا اور ساغر پلا دے مری جاں
نہیں فکر انور ہے گرچہ مسلماں
پلا دے پلا دے پلا دینا ساقی

جانِ بہار

مخمور نگاہوں کے چھلکتے ہوئے ساغر
ساغر وہ مئے ہوش رُبا جن میں بھری ہے

چہرے پہ پریشان ہوئی زلفِ معنبر
یا چاند کے عارض پہ گھٹا جھوم رہی ہے

خود ماہِ منوّر ہے گھٹاؤں سے ضیا بار
زلفوں میں ترے حسن کی یا جلوہ گری ہے

آنکھوں کے چھلکتے ہوئے ساغر ارے توبہ
نمناک نگاہوں میں مئے ناب بھری ہے

بیتاب ترے حسن کی خاطر ہے زمانہ
برباد تیرے عشق میں ہر چیز ہوئی ہے

یوں مست گلستاں میں تجھے دیکھ کے پیہم
گر گر کے ہر ایک شاخ قدم چوم رہی ہے

دنیائے محبت کی فضا جھوم رہی ہے

ساون کے دن

تبسّم کے دریا بہانے کے دن ہیں
ترنّم کی موجیں بڑھانے کے دن ہیں
ترانے محبّت کے گانے کے دن ہیں
ہر اک شے کو رنگیں بنانے کے دن ہیں
نصیبوں کی دُنیا جگانے کے دن ہیں

چمن تو چمن اب تو صحرا ہے گلشن
بہاراں کا عالم یہ پھولوں کا جوبن
زمیں کا ہوا سبز سبزے سے دامن
نئی شان سے اب کے آیا ہے ساون
محبّت کی دُنیا بسانے کے دن ہیں

بیاباں بھی دیکھو تو کیسے بھلے ہیں
کہ ہر سمت اب پھول بکھرے پڑے ہیں
جدھر دیکھئے سبز مخمل بچھے ہیں
جو رقصاں ہیں طاؤس مستی بھرے ہیں
محبت میں ہلچل مچانے کے دن ہیں

چھڑا سازِ اُلفت زمانے میں ہمدم
ہوا شور جھولوں کا گلشن میں پیہم
لبِ نہر مشّاق چہکے ہیں بے غم
یہ آتی صدائیں ہیں غنچوں سے ہمدم
یہی دن تو لُٹنے لُٹانے کے دن ہیں

ہے دلکش چمن میں سحر کا یہ منظر،
نسیم سحر جب کہ چلتی ہے سرسر
فضا ساری ہوتی ہے مست و معطر
تو کلیاں یہ کہتی ہیں انور چٹک کر
جوانی کو رنگیں بناتے کے دن ہیں

سہرا

بتقریب سعید شادی خانہ آبادی برخوردار سید مظفر علی سلمہٗ

جگمگاتا ہوا نوشاہ کے سر پر سہرا
جلوۂ مہر ہے یا ماہِ منوّر سہرا

آج لختِ دلِ خورشید کی خاطر انجم
طشتِ مہتاب میں لائے ہیں سجا کر سہرا

صحنِ گلشن میں شگفتہ گلِ تازہ جیسے
بزمِ انجم میں مثالِ مہ انور سہرا

بزمِ اُلفت میں ہے یہ عشرتِ ہستی کا پیام
رزمِ ہستی میں ظفر مند و مظفر سہرا

حسن و رعنائی میں گلہائے چمن سے زائد
زیب و زینت میں ستاروں سے ہے بڑھ کر سہرا

منعکس اس میں جو ہیں نورِ علیؑ کی کرنیں
رشکِ خورشید نہ کیوں ہو مہ انور سہرا

تارِ خورشید کی کرنوں کے ستارے موتی
ڈھل گیا نور کے سانچے میں سراسر سہرا

سلسلہ عقدِ ثریّا سے ملا ہے اس کا
اوج پر اپنے جو نازاں ہے مُظفّر سہرا

شاد بے حد ہیں رشیدہ ہوں کہ فرزانہ ہوں
پڑھ کے خوش ہوتے ہیں اب ربّی و اصغر سہرا

چاند تاروں میں چمک گُل میں ہے خوشبو جتنک
جگمگاتا رہے مثلِ مہ و اختر سہرا

عمرِ نوحؑ اِن کو ملے اور ہمیشہ انورؔ
دولہا دلہن میں رہے پیار کا مظہر سہرا

نوٹ: ص۱ دادا، ص۲ والد، ص۳ والدہ، ص۴ دولہا، ص۵ دلہن
ص۶ تا ۸ بھائی، ص۹ تا ۱۱ بہنیں

رُخصتی

تبقریبِ سعید عقدِ مسنونہ نورِ چشمی رشیدہ بیگم سلمہا ہمراہ عزیزی
سیّد شکیل احمد سلمہٗ فرزندِ کلاں جناب الحاج سیّد مظہر علی صاحب ضیا زاد لطفہٗ

رشیدہ بھی لو آج دُلہن بنی

رہا ہے ہمیشہ سے عالم یہی — کہ بیٹی جواں ہو تو ہے غیر کی
مگر اس میں مجبور ہے آدمی — حقیقت میں غم ہے یہ عینِ خوشی
خدا کی عنایت جو انور ہوئی — خوشی کی یہ ساعت میسّر ہوئی

رشیدہ بھی لو آج دُلہن بنی

ہے چاروں طرف عالمِ سرخوشی — فضا بھی ہے نغموں میں ڈوبی ہوئی
مسرّت کی کیا کیا ہے جلوہ گری — لگا ہے جو اُبٹن تو مہندی رچی
سہیلی ہے ڈھولک پہ گاتی یہی — بنی آج سسرال اپنے چلی

رشیدہ بھی لو آج دلہن بنی

مسرت میں ہر ایک ڈوبا ہوا،
زمانے میں خوشیوں کا سکہ جما
ادھر خلد میں ہاتھ اپنے اٹھا
ہوئی روحِ خورشید محوِ دعا
ملائک نے بڑھ کر دی ہیں دی صدا
مبارک تمنا یہ پوری ہوئی

رشیدہ بھی لو آج دلہن بنی

ہیں شادی کے کاموں میں مصروف
بہن ہوں کہ بھائی یہ کیف طرب
خوشی کا وہ عالم ہے انور کہ اب
دل و جاں سے مصروف ہیں کیسے سب
ہر اک کہہ رہا ہے بجوشِ طرب
مبارک ہے بیٹی کی قسمت بڑی

رشیدہ بھی لو آج دلہن بنی

بسر عمر شوہر کی خدمت میں ہو
خدا اور نبیؐ کی اطاعت میں ہو
کمی کچھ نہ آپس کی الفت میں ہو
بسر زندگانی محبت میں ہو

رضائے الٰہی کی چاہت میں ہو
نصیحت ہے میری یہی آخری
رشیدہ بھی لو آج دُلہن بنی

ماں رشیدہ کی والدہ مرحومہ خورشید بیگم

(اپریل ۱۹۷۳ء)

سہرا

بتقریبِ سعید شادی خانہ آبادی برخوردار سیّد منوّر علی سلمہٗ

۹ جون 1973ء مطابق ۷ جمادی الاوّل ۱۳۹۳ھ بروز سہ شنبہ

آج یہ بختِ دلِ خورشیدؔ کے سر پر سہرا
ہے ضیا بار مثالِ مہِ انورؔ سہرا

بوئے اُلفت سے معطّر ہیں معطّر کلیاں
نورِ ایماں سے منوّر ہے منوّر سہرا

کشورِ حُسن میں دیکھو تو بہ فیضِ اُلفت
غلبۂ عشق کا عالم میں ہے مظہرؔ سہرا

بزمِ انجم سے کہیں بڑھ کے ہے رونق اسکی
جلوہ افروز ہے محفل میں منوّر سہرا

دور و نزدیک سے اُٹھ اُٹھ کے نگاہِ مشتاق
چوم لیتی ہے بھری بزم میں بڑھ کر سہرا

حسن و رعنائی پہ پھولوں کی فدا ہے گلشن
زیب و زینت میں ہے رشکِ مہ و اختر سہرا

اس کے ہر پھول میں ہے نورِ علیؑ کی تابش
بقعۂ نور ہے مثلِ مہ انور سہرا

اس کے آگے مہ و اختر کی حقیقت کیا ہے
حسنِ خورشید کا پرتو ہے منوّر سہرا

ساتھ پھولوں کے جو آئی ہے گلستاں سے شمیم
روح و جاں کو کئے دیتا ہے معطّر سہرا

پھول گلزارِ محبت سے وفا کے چن کر
رشکِ گلزار بناتے ہیں سخنور سہرا

چاند تارے ہیں تصدق تو ثریا[12] قرباں
پیکرِ نور ہے دیکھو تو سراسر سہرا

خوش جو ربی[1] و مظفر[2] ہیں رشیدہ[3] دل شاد
پڑھ کے خوش ہوتے ہیں فرزانہ[4] و اصغر[5] سہرا

جلوہ افروز ہیں یارب مہ و انجم جب تک
جگمگاتا رہے نوشاہ کے سر پر سہرا

گلشنِ فکر سے لے آئے ہیں ہم بھی انور
بوئے گل ہائے محبت میں بسا کر سہرا

ص۱ دادا، ص۲ والد، ص۳ والدہ (مرحومہ) ص۴ دولہا، ص۵ دلہن

ص۶ تا ۱۱ بھائی اور بہنیں، ص۱۲ بھابی

کلامِ شفا

سیّد محمد حسین شفاؔ گوالیاری مرحوم میرے ہم زلف تھے انہوں نے میری شادی کے موقع پر ایک سہرا لکھا تھا پھر میرے بیٹے منوّر کی پیدائش پر دو قطعات بھی عنایت فرمائے تھے سہرا اور قطعات ذیل میں درج کر رہا ہوں۔ انورؔ

بہارستان

بتقریب سعید شادی عزیزی سیّد انور علی صاحب
خلف محترمی جناب سید نور علی صاحب زادلطفہٗ

ساتھ لے کر آئے ہیں کیف و اثر سہرے کے پھول
دیکھنے والے ہیں بیخود دیکھ کر سہرے کے پھول

بے خبر او سہرے والے کچھ خبر بھی ہے تجھے
ہیں وفا و عیش کے پیغام بر سہرے کے پھول

چشمِ بد بیں سے بچانا تھا رخِ نوشاہ کو
بن گئے ہیں اسلئے مدِّ نظر سہرے کے پھول

ہو نہ ہو مانو نہ مانو سعیٔ پابوسی میں ہیں
جب تو جھک کر آرہے ہیں پاؤں پر سہرے کے پھول

اللہ اللہ یہ حسیں منظر یہ ماحول جمیل
ہیں دُختر ناز کی لڑیاں او رادھر سہرے کے پھُول

آپ کے نورِ نظر کی نورِ علی شادی ہے آج
پھر بھلا کیوں ہوں نہ منظورِ نظر سہرے کے پھُول

ہے ہی آئی آج دادی کی دُعا اپنا اثر
آج ہو کر ہی رہے شایانِ سر سہرے کے پھُول

پھولتا پھلتا رہے یہ باغِ سادات اے خدا
مسکراتے ہی رہیں یہ عمر بھر سہرے کے پھُول

کِس قدر دلکش ہیں نغماتِ حسیں تیرے شفا
دے رہے ہیں داد تجھ کو جھوم کر سہرے کے پھُول

قطعہ

باپ کی ماں کی دعاؤں میں اثر پیدا ہوا
انبساطِ دل نشاطِ روح تسکینِ نظر پیدا ہوا
سارا گھر انوارِ رحمت سے منوّر ہے شفاؔ
(والد) (نومولود)
جلوۂ خورشید کے نورِ قمر پیدا ہوا
(والدہ) (دادا)

قطعہ

(تاریخی نام)

مبارک ہو بچّے کی قسمت بڑی ہے
خدا کا پیارا ہے جانِ نبیؐ ہے
شفاؔ دل کے پردوں سے آواز آئی
کہ یہ میر سیّد ذکریا علی ہے
۱۳۶۵ھ

کلامِ شوق

میرے والد صاحب قبلہ سیّد نور علی صاحب مرحوم بھی شعر کہتے تھے اور شوقؔ تخلّص کرتے تھے ذیل میں اُن کے چند اشعار درج کر رہا ہوں۔ ا.ر

غزل

(۱)

دل کو جگر کو جسم کو جاں کو جلا کے ہم
بیٹھے نہ اب بھی چین سے ہستی مٹا کے ہم

اب شور بھی مچائیں تو سنتا ہے بات کون
قبضہ میں آ چکے ہیں کسی بے وفا کے ہم

کرتا ہے ہم کو شوقؔ مخاطب وہ کس طرح
دیکھیں گے اُس کی بزم میں اک روز جا کے ہم

غزل

(۲)

نہ بوئے گلستاں اپنی نہ رنگِ گلستاں اپنا
بنائے باغِ ہستی میں کوئی کیا آشیاں اپنا

ابھی تو جسم میں جاں ہے ابھی کر لو جو کرنا ہے
نہ ہو گی جاں ہی جب اپنی نہ ہو گا کچھ یہاں اپنا

یکایک جب بجے گا شوقؔ ایک دن کوچ کا ڈنکا
سمٹ جائیگا سب پھیلا ہوا یہ کارواں اپنا

ص ۱ : والد صاحب قبلہ نے ۵ اگست ۱۹۷۷ء بروز جمعہ کراچی میں انتقال فرمایا۔ اللہ تعالٰے مغفرت فرمائے۔ آمین

(مطابق ۱۸ شعبان ۱۳۹۷ھ)

سخن ہائے گفتنی

(پیش لفظ، تعارف، تبصرے
اور خطوط)

فہرست

۱۔ پیش لفظ .. .. مولانا ماہر القادری

۲۔ تعارف و تبصرہ .. .. ڈاکٹر محمد مسعود احمد

۳۔ بوٹم کا شاعر .. .. ڈاکٹر فرمان فتحپوری

۴۔ تقریظ .. .. ڈاکٹر سید یادر عباس

۵۔ بوٹم میری نظر میں .. .. ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

۶۔ بوٹم ارتقاء کے آئینہ میں .. .. پروفیسر ایف ایم شیخ

۷۔ سید انور علی انور کی شاعری کا رنگ .. پروفیسر فیاض احمد خاں کاوش

۸۔ جائزہ .. .. محمد وفی خاں یوسف زئی (ایڈوکیٹ)

۹۔ تاثر .. .. سید مکرم علی سیفی فرید آبادی (ایڈوکیٹ)

۱۰۔ خطوط .. .. .. (۱) حفیظ جالندھری

(۲) ڈاکٹر ممتاز حسن (مرحوم)

(۳) سید نور محمد قادری

(۴) سید ہاشم رضا

(۵) مولانا ماہر القادری (مرحوم)

۱۱۔ اخباری تبصرہ .. .. روزنامہ جنگ

(۱) مولانا ماہر القادری

پیش لفظ

سیّد النور علی انور پیشہ ور شاعر نہیں ہیں، انہیں خود بھی بڑے شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ مگر ان کی طبیعت اور ذوق کو شعر و سخن سے فطری مناسبت ہے۔ وہ دلِ دردمند بھی رکھتے ہیں، اسی لئے جذبات و واردات بے اختیار شعروں کے قالب میں ڈھل گئے۔ وہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے اس طوفان کو روک بھی نہیں سکتے تھے۔

انور صاحب کے مجموعۂ کلام کا نام "بوٹم" ہے جو ہر پڑھنے والے کو اجنبی محسوس ہوگا مگر اس تلمیح کی خود شاعر نے تشریح کی ہے کہ یہ اُن کی شریکِ زندگی خورشید بیگم مرحومہ کا پیار کا نام ہے۔ سیّد النور علی انور کو اپنی جانِ نہار بیوی سے غایت درجہ کی محبت تھی۔ اپنے مجموعۂ کلام کا نام "بوٹم" رکھ کر انہوں نے اس محبت کا حق ادا کیا ہے۔

مغرب زدگی نے ہماری خانگی زندگیوں پر بھی خاصہ اثر ڈالا ہے۔ گھریلو ماحول میں اگلا سا پیار اور روابط نہیں رہے۔ میاں بیوی کے درمیان آئے دن کی کِلکِل سے بہت ہی کم گھرانے محفوظ ہوں گے۔ مگر سیّد النور علی انور نے اپنی شریکِ زندگی کے ساتھ اخلاص و محبت کے روابط میں ہمارے معاشرے کے لئے ایک مثال قائم کر دی ہے۔ اہلیہ کی جدائی اور سانحۂ انتقال نے انور صاحب کو سراپا فغاں و فریاد بنا دیا ہے۔ اور اس المیہ

نے ان کی شاعری میں سوز اور تاثیر پیدا کی ہے۔

انور صاحب نے حمد، نعت، غزل، نظمیں اور قطعات غرض ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انہیں اس کا بھی احساس ہے کہ اُمّت مشرکانہ رسوم و بدعات میں مبتلا ہو گئی ہے۔ یہ خلش شعر کی صورت اختیار کرتی ہے۔

تقلیدِ اہلِ شرک تجھے کیوں ہوئی پسند
اے اُمّتِ رسولؐ خدارا جواب دے

شعر کی زبان میں سیاست کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے۔

کر دیا ساقی نے کم ظرفوں کے میخانہ سپرد
مے پہ کیا گذرے نہ جانے جام کیا بن جائے گا

اور یہ سب قیامتیں ہم پر گذر رہی ہیں۔

ہجر میں شاعر کا یہ حال ہے۔

زندہ ہیں ترے ہجر میں اے دوست مگر اب
ہے سانس رواں سینہ میں تلوار کی صورت

سانس جب تلوار بن جائے تو مریضِ شبِ ہجر کا کیا حال ہو گا!

اتحاد و یک جہتی کی تعلیم کس اثر انگیز انداز میں دی گئی ہے۔

صدا اک طائرِ بسمل کی کیا پہنچے گی گلشن تک
اسیرانِ قفس آؤ کہ ہم آواز ہو جائیں

اسیرانِ قفس کے اتحاد اور ہم آہنگی ہی سے صیاد کا طلسمِ جور و بیداد ٹوٹ سکتا ہے۔

اس شعر میں۔

ملتے ہی گلے یار سے یوں ٹوٹ کے برسی

اشکوں کی گھٹا جیسے برسنے کو کھڑی تھی

زبان دردِ زمرہ کا کتنا لطف انگیز چٹخارہ پایا جاتا ہے۔

ہو چکا دل خوں کسی کا جب تو وہ کافر نظر
کس قدر معصوم، کیا انجان ہو کر رہ گئی

"غمِ محبوب" پر یہ شعر۔

تجھ کو میں اے غمِ محبوب بھلا دوں کیوں کر
تجھ سا دنیا میں کہاں مونسِ تنہائی ہے

ایک بار پڑھ کر ہر اہلِ ذوق کو یاد ہو جائے گا۔

انور صاحب شعر ایسے عالم میں کہتے ہیں جب طبیعت میں آمد ہوتی ہے۔

آج پھر مست گھٹا جھوم کے اٹھی انور
آج تو پھر کوئی اچھی سی غزل ہو جائے

سید انور علی انور نے قومی نظمیں بھی کہی ہیں۔ وہ اپنے اندر اسلام اور ملت کا درد رکھتے ہیں اور پاکستان کے سچے بہی خواہ ہیں۔ ان کے دل کی چوٹیں اشعار کے قالب میں ڈھل کر جہاں "سحرِ حلال" بن گئی ہیں وہ مقامات ہر اہلِ نظر اور اہلِ دل کو دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔

گوناگوں مصروفیات کے ہجوم میں یہ چند سطریں راقم الحروف نے سپردِ قرطاس و قلم کی ہیں کلام کے بارے میں صحیح فیصلہ قارئین ہی کریں گے۔

ماہر القادری

کراچی
۱۱ مئی ۱۹۷۴ء

(۲)

ڈاکٹر محمد مسعود احمد
ایم اے پی ایچ ڈی

تعارف و تبصرہ

صاحبِ دیوان جناب سید انور علی صاحب انورؔ زید مجدہٗ کا سلسلۂ نسب متعدد واسطوں سے حضرت امام رضاؒ سے ملتا ہے۔ موصوف کے جدِ اعلیٰ میر علی نقی مرحوم سرزمینِ عرب سے ہندوستان تشریف لائے اور دارالسلطنت دہلی میں اقامت گزیں ہوئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد یہ خاندان منتشر ہو گیا۔ جنابِ انورؔ کے جدِ امجد میر سید علی شائقؔ دہلوی (متوفی ۱۹۲۰ء) ترکِ وطن کر کے نصیر آباد (راجپوتانہ بھارت) آگئے اور یہیں انتقال فرمایا۔ مرحوم باکمال شاعر تھے۔ اس فن میں ان کی متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ فنِ لغت میں ایک بے نظیر اور نادرالوجود تصنیف بھی ہے۔ مرحوم کے صاحبزادے اور جنابِ انور کے والد ماجد جناب سید نور علی صاحب مدظلہٗ بھی شاعر ہیں اور شوقؔ تخلص فرماتے ہیں۔ اُن کے چند اشعار اس دیوان کے آخر میں شامل کئے گئے ہیں۔

جنابِ انورؔ بھی اپنے والدِ ماجد اور جدِ امجد کی طرح باکمال شاعر ہیں۔ ان کا ذوقِ شاعری موروثی بھی ہے۔ اور وہبی بھی۔ وکالت کے غیر ادبی پیشے میں اس ذوق کو زندہ رکھنا بلکہ اس میں کچھ لکھنا ذوقِ صادق کی بیّن، دلیل ہے۔

سیّد انور علی صاحب انور نے سیّد پبلیکیشنز (کراچی) کے نام سے ایک ادبی و علمی ادارہ قائم کیا ہے۔ اس ادارے سے موصوف نے اپنے جدِ امجد حضرت شائق دہلوی کی ۱۹ تصانیف میں سے مندرجہ ذیل تین تصانیف شائع کی ہیں۔

۱۔ شائق اللغات (جلد اول) (غیر منقوط الفاظ کی نادر لغت) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء۔

۲۔ گلگشتِ بہشت (حمد و نعت اور منقبت کا مجموعہ) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۴ء

۳۔ گلزارِ مغفرت (مراثی و سلام کا مجموعہ) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء

مندرجہ بالا مطبوعات کے علاوہ قانون، الٰہیات و دینیات وغیرہ کے متعلق انگریزی زبان میں جنابِ انور کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں یا زیرِ طباعت ہیں۔

قانون

۱۔ لاز آف پاکستان (۲۰ جلدوں میں سے ۴ جلدیں شائع ہو چکی ہیں)

۲۔ الیکشن لاز ان پاکستان (مطبوعہ ۱۹۶۵ء)

۳۔ رینٹ لاز ان پاکستان (مطبوعہ ۱۹۶۳ء)

۴۔ بینکنگ لاء ان پاکستان (مطبوعہ ۱۹۶۸ء)

۵۔ مسلم لاء سمارائیزڈ (مطبوعہ ۱۹۶۱ء)

۶۔ لاء آف فیملی کورٹس (مطبوعہ ۱۹۶۹ء)

الٰہیات و دینیات

۱۔ لائف دی ایسنس آف آلٹی میٹ ریالٹی (مطبوعہ ۱۹۷۱ء)
۲۔ ریلیجن دی سائنس آف لائف (زیرِ طبع)
۳۔ اسلام دی ریلیجن (زیرِ طبع)

سید انور علی انور کا پیشِ نظر مجموعۂ کلام حمد و نعت، غزلیات اور منظومات (مخمس، مسدس، مسبع، ترکیب بند وغیرہ) پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کا عنوان "بوٹم" جنابِ انور کی اہلیہ مرحومہ کی عرفیت کا مرہونِ منت ہے۔ اور اس کا بیشتر حصہ مرحومہ ہی کی یاد میں کہا گیا ہے۔

غم ترا آخر زباں تک آ گیا — رازِ دل حرف و بیاں تک آ گیا

انور علی انور نے محبت کو زندہ رکھا ہے اور اس کی یاد میں نغمہ سرائی کی ہے جو قابلِ صد ستائش ہے۔

جب دل پر ٹھیس لگتی ہے تو آہ تاب شکن، شعر کے قالب میں ڈھل کر تیر و نشتر بن جاتی ہے۔ دلِ زخمی نہ ہو تو غزل ہو ہی نہیں سکتی۔ غزل تو غزل خود شاعری ناممکن ہے۔ جگر نے خوب کہا ہے۔

اللہ اللہ ہستیٔ شاعر — قلب غنچے کا، آنکھ شبنم کی

انور نے چوٹ کھائی ہے اس لئے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے اور خوب کہا ہے۔

کوئی کیا سمجھے گا انور کس کے غم کی داستان
شاعری میں اپنی دنیا کو سنا جاتے ہو تم

دیوان کے اکثر اشعار ترجمانِ غم ہیں جو اہلِ فراق کے دل کی آواز ہیں۔ ذرا یہ شعر تو ملاحظہ فرمائیں۔

جینا کسی کے ہجر میں دشوار ہو گیا
ہر سانس ہم کو زیست میں تلوار ہو گیا

اللہ اللہ جس کا ہر سانس تلوار ہو اس کے درد و کرب کا کیا عالم ہوگا۔

وصل میں کائنات کا ذرّہ ذرّہ دلکش معلوم ہوتا ہے، غیریت کا پردہ اٹھ جاتا ہے عینیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ لیکن فراق میں ہر شے اجنبی اجنبی سی معلوم ہوتی ہے حتیٰ کہ جانے پہچانے کوچہ و بازار۔ اور در و دیوار بھی اجنبی معلوم ہوتے لگتے ہیں۔ عاشقِ دل فگار کی اس نفسیاتی کیفیت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

ہر ایک گلی انجانی سی ہر کوچہ ہے بیگانہ سا
اس دیس میں تیرا چاہنے والا پھرتا ہے دیوانہ سا

بے شک احوال بدل جانے سے ماحول بدل جاتا ہے۔ دل کی دنیا بدل جانے سے دنیا بدل جاتی ہے۔ لیکن بدل جانے والی یہ کیفیت فراق کے کچھ عرصہ بعد تک قائم رہتی ہے، پھر رفتہ رفتہ خود بخود ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہاں محبت میں صداقت و خلوص ہو تو پھر ہزار فراموشیوں کے باوجود یاد آہی جاتی ہے، جانے والا بھلائے نہیں بھولتا۔ انور نے اس کیفیت کو کیسے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

ایک مدت ہوگئی ترکِ تعلق کو مگر
آج بھی احساس کی دنیا پہ چھا جاتے ہو تم

دستورِ زمانہ ہے کہ غم و الم میں ہمدرد و غمگسار آتشِ غم بجھانے آتے ہیں لیکن شاعر ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بظاہر یہ لوگ اپنی ہمدردی و غمگساری سے آگ بجھاتے ہیں لیکن نہیں نہیں وہ تو بھولے ہوتے غموں کو یاد دلا کر اور آگ لگا جاتے ہیں۔

شکریہ ہمدردیوں کا دوستو! لیکن مجھے

یاد اک بھولے ہوئے غم کی دلا جاتے ہو تم

غمِ جاناں سے مجبور ہو کر کبھی کبھی انسان قیدِ حیات سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس قید سے نجات انسان کے بس کی بات نہیں۔ انسان بالکل بے بس ہے۔ انور نے اس بے بسی کو کتنے درد انگیز انداز میں بیان کیا ہے

گھبرا گیا ہوں کشمکشِ زندگی سے میں
زندہ ہوں ہجرِ یار میں بیچارگی سے میں
ملنا محال بھولنا ممکن نہیں تجھے
زندہ ہوں تیرے ہجر میں کس بے بسی سے میں

سیّد انور علی انور کے مجموعۂ کلام کا مطالعہ کیا جائے تو اہلیہ مرحومہ کی یاد پورے دیوان پر چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ غزلیات کے علاوہ مندرجہ ذیل نظمیں اسی یاد کی مرہونِ منّت ہیں۔

چھُپ گیا خورشید وقتِ شام ہے
آہ اے خورشید
پھول

یہ تمام غزلیں اور نظمیں نہایت پر تاثیر اور غم انگیز ہیں۔

لیکن اہلیہ مرحومہ کی داستانِ فراق کے علاوہ اس دیوان میں عاشقانہ عارفانہ، متصوفانہ، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی غزلیں اور نظمیں بھی ہیں

عشق ایک ایسا جذبہ ہے جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ آشنا ہے۔ لیکن یہ کہیں خوابیدہ ہے، اور کہیں بیدار، جہاں بیدار ہوتا ہے وہاں قیامت ڈھاتا ہے انور علی انور نے اس عالمگیر حقیقت اور اس کی مختلف کیفیات کو اس طرح بیان کیا ہے۔

بس اک نگاہِ مست کا اللہ رے اثر
عالم تمام جیسے کہ میخوار ہوگیا
شب فراق کے لمحے بھی اہلِ دل کے لئے
فروغِ جذبِ محبت حصولِ راحتِ جاں
شوخی میں دلبری میں ستم میں حیا میں حُسن
چھلکے ہے مست نازکی ہراک ادا میں حُسن
اظہار ہو غم کا نہ کبھی عرضِ تمنّا
وہ شانِ محبت ہے یہ ہے آنِ محبت
ملتے ہی گلے یار سے یوں ٹوٹ کے برسی
اشکوں کی گھٹا جیسے برسنے کو کھڑی تھی
یہ دردِ محبت ہے دعا دے نہ دوا دے
بیمار کو بس اپنے ہی دامن کی ہوا دے (یہ پوری غزل ہے)
ٹکرائیں وہ نظریں تو ہوا یوں محسوس
نشتر کئی جیسے رگِ جاں تک پہنچے

شراب اور عشق کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ ذرا خمریات میں انور کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

محفل میں دور ہی سے نہ ہم کو دکھا شراب
ساقی کبھی تو شوق سے بڑھ کر پلا شراب
اُس چشمِ مست کا یہ تصرّف تھا بزم میں
ساغر تھا دلنواز تو تھی جاں فزا شراب
اُس چشمِ مے گسار کا اللہ رے اثر

عالم تمام عالمِ مستی میں تھا شراب

اور یہ نظم تو بہت ہی خوب ہے۔

پلا دے پلا دے پلا دے تا ساقی

انور علی انور نے عارفانہ اور متصوفانہ اشعار بھی کہے ہیں۔ جب تک قلب و نظر کو جِلا نہ ملے ایسے شعر کہنا بہت ہی مشکل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل کو غمِ فراق کا خوگر بنا دیا ہر تلخیٔ حیات کو خوشتر بنا دیا

(یہ پوری غزل مرصّع ہے)

ہے دیکھئے تو گوشۂ دل میں مرے مکیں

وہ حسن جو نہ کون و مکاں میں سما سکا

پتھر کی ایک سادہ عمارت کو دیکھئے

ان کی نگاہِ لطف نے کعبہ بنا دیا

ترا حسن آنکھوں میں کیا بس گیا ہے

جسے دیکھتے ہیں جواں دیکھتے ہیں

ہمیں کام اُن کی رضا سے ہے ہمیں لاکھ رنج و الم سہی

جو عطا کریں وہ قبول ہے وہ ستم ہو گر تو ستم سہی

تری آرزو میں جینا تری جستجو میں مرنا

جو یہ مل گیا تو سمجھوں مجھے مل گئی خدائی

انور نے جدید معاشرے اور جدید تہذیب پر بھی سخت تنقید کی ہے۔ یوں تو تنقید کرنے والے تنقید کرتے ہیں مگر تنقید کا حق صرف اسی شاعر کو ہے جو خود پیکرِ فضائل ہو۔ انور مجسّمۂ شرافت و انسانیت

ہیں۔ وہ ان شعراء میں نہیں جن کے متعلق قرآن حکیم کہتا ہے۔

"اور شاعروں کو تو دیکھئے بھٹکتے ہوئے لوگ ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ ہر وادی (فکر و عمل) میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اور یہ شاعر جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔"

بلکہ ان شعراء میں ہیں جن کے ایمان و عمل پر قرآن گواہ ہے۔ یقیناً ایسے عاملِ شریعت اور متبع سنت کو جدید تہذیب و تمدن اور جدید معاشرہ پر تنقید کا پورا پورا حق ہے۔

کیا حرص نے یہ زیست کا نقشہ بنا دیا
انساں کو بے حیائی کا پتلا بنا دیا
انساں ہیں پھر بھی نام کو انسانیت نہیں
انور ہمیں فرنگ نے کیا کیا بنا دیا
ہلاکت خیزیاں اس کی بھی دیکھا چاہئیں چل کر
وہ دنیا جس میں خود انسان مقدر ساز ہو جائیں
تزئین کے پردے میں عریاں ہوا جاتا ہے
انسان کو دیکھو تو حیواں ہوا جاتا ہے
لے آئی ہے دنیا کو تہذیب یہاں تک تو
انسان کا دشمن خود انساں ہوا جاتا ہے
دنیا کی ترقی سے انور یہ حقیقت ہے
انساں کی ہلاکت کا ساماں ہوا جاتا ہے

اور اسی موضوع پر یہ پوری غزل مرصع ہے۔

کسی کو کسی کی خبر ہی نہیں ہے　　کسی پر کسی کی نظر ہی نہیں ہے

نظم "دیس" (ص ۱۸۱) میں قومِ مسلم کی اخلاقی پستی کا حال بیان کیا ہے۔ اسی موضوع پر صفحہ ۱۹۳ پر بھی ایک نظم ملتی ہے جس میں دخترانِ قوم کی غیر مہذب روش پر سخت اور دل پذیر تنقید کی گئی ہے۔

معاشرے پر تنقید کے علاوہ بعض اشعار اور نظموں میں سیاستِ حاضرہ کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ انسان سیاست سے خواہ کتنا ہی علیٰحدہ ہو لیکن ایسا بے حس نہیں کہ گرد و پیش کے حالات سے بالکل بے خبر ہو اور ان کے متعلق نہ کچھ سوچے اور نہ کچھ کہے۔ انور اگرچہ سیاست سے علیٰحدہ ہیں لیکن سیاسی بصیرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ نظم "وہ قوم نہ کافر نہ مسلمان ہے یارو" (ص۔ ۱۸۳) سیاستِ حاضرہ پر کامیاب تنقید ہے۔ اور اس شعر میں تو اشاروں اشاروں میں وہ سب کچھ کہہ دیا جس کی تشریح کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔

یلغار میکدہ پر اب اہلِ ہوس کی ہے
اے میکشو! یہ وقت کچھ آرام کا نہیں ہے

نظم "چیلنج" (ص۔ ۱۹۶) بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

غزلیات اور مختلف موضوعات پر منظومات کے علاوہ اس دیوان میں سہرے بھی ہیں۔ (ص۔ ۲۱۱ تا ۲۱۳ اور ۲۱۷ تا ۲۱۹) رخصتی بھی ہے (ص۔ ۲۱۴، ۲۱۶) مرثیے بھی ہیں (۱۸۵، ۱۸۹) اور جوانی کی یادگار عاشقانہ نظمیں بھی ہیں۔ نظم "آمد" (ص۔ ۱۷۷) قابلِ مطالعہ ہے۔ جذبات و احساسات کا ایک سیلاب امنڈتا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا پہلا بند ملاحظہ فرمائیں۔

جانِ جاں جانِ جہاں آنکو ہے آرزوئے عاشقاں آنے کو ہے

صدرِ بزمِ گل رخاں آنے کو ہے تاجدارِ مہ وشاں آنے کو ہے

آج رشکِ دلبراں آنے کو ہے

اسی طرح نظم "کالج میں پہلا دن" (ص۔ ۲۰۰) میں نوعمری کے معصوم جذبات کا بڑا حسین نقشہ کھینچا ہے۔ نظم "جانِ بہار" (ص۔ ۲۰۶) میں جذبات حسن و عشق کی خوب عکاسی کی ہے اور نظم "ساون کے دن" (ص۔ ۲۰۸) میں مناظرِ قدرت کے ساتھ ساتھ جذباتِ حسن و عشق کی خوب آمیزش کی ہے۔

الغرض یہ دیوان سید انور علی انور کے جذبات و واردات کا آئینہ ہے۔ اس آئینے میں دوسرے حضرات بھی اپنے قلبی احساسات اور کیفیات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہ آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ غم نامۂ فراق بھی ہے اور مژدۂ وصال بھی اور انسانیت کی پکار بھی۔ خدا کرے یہ کلام اپنی تاثیر دکھائے اور اہلِ ذوق میں مقبول و محبوب ہو

۱۳ ربیع الثانی ۱۲۹۴ھ

۶ مئی ۱۹۷۴ء

گورنمنٹ کالج ٹنڈو محمد خان سندھ

محمد مسعود احمد

(۳)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری
ایم اے پی ایچ ڈی
ڈی لٹ

بوٹم کا شاعر

کہا جاتا ہے کہ شعر گوئی کے لئے تیز مشاہدے، وسیع مطالعے اور ایک حساس طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ باتیں صحیح ہیں، شاعری میں آفاقی اور ابدی آثار ان کے بغیر نہیں پیدا ہوتے لیکن میرے نزدیک یہ چیزیں شاعری کے لئے بنیادی نہیں ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ اساسی طور پر شاعری ایک خاص قسم کے ذوق کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسے عرفِ عام میں ادبی ذوق یا خوش ذوقی بھی کہتے ہیں۔ اس خوش ذوقی کا دوسرا نام جمالیاتی حِس کی بیداری بھی ہے۔ یہ خوش ذوقی یا بیداری کتابوں کے مطالعے یا علم و فن میں میکانکی مہارت حاصل کرنے سے نہیں، مخصوص ماحول میں ایک مدّت تک تربیت پانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ تربیت لاشعوری طور پر پہلے ایک شخص کو وزن و آہنگ، صوتی کیفیات اور الفاظ کے ظاہری حسن اور معنوی جمال افروزی سے مانوس کراتی ہے۔ پھر یہی تربیت رفتہ رفتہ اسے زبان کی اس سطح سے آشنا کر دیتی ہے جو روزمرّہ یا لغت کی زبان کی سطح سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ لغت اور ایک عام آدمی کی نظر میں قاتل کے معنی صرف قاتل اور کافر کے معنی صرف کافر ہوتے ہیں لیکن ذرا مندرجہ ذیل دو شعر دیکھئے۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو

یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے (مظہر جانِ جاناں)

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جاتے ہے مجھ سے (غالب)

ان شعروں میں قاتل اور کافر کے معنی قتل کرنے والے اور منکرِ خدا کے نہیں بلکہ محبوب اور پیارے کے ہیں۔ یہی صورت میر تقی میرؔ کے اس شعر کی ہے۔

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

یہاں پتہ، بوٹا، گل اور باغ کے وہ معنی نہیں جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، ان کے معنی پرت در پرت ہیں اور ان سے وہی لوگ لطف اٹھا سکتے ہیں جو محض اسکالر یا عالم نہ ہوں بلکہ وہ ذوقِ خاص بھی رکھتے ہوں جو مطالعے سے نہیں ذہنی تربیت سے پیدا ہوتا ہے۔

مجھے "بوٹم" کے شاعر سید انور علی انورؔ میں وہ خوش ذوقی و خوش فکری جس کے بغیر شاعری کی تخلیق یا تفہیم ممکن نہیں، پوری طرح نظر آتی ہے۔ ان کا کلام ان کی خوش ذوقی اور لطافتِ طبع کا واضح ثبوت ہے یہ خوش ذوقی اور لطافتِ طبع انہیں اپنے ماحول اور اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہے اور بعد کو ریاضتِ فن کے ذریعے انہوں نے اُسے جِلا بھی دی ہے انورؔ کے دادا میر سید علی صاحب شائقؔ دہلوی مرحوم صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کے والد بھی شاعر ہیں، اور شوقؔ تخلص کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ "بوٹم" کا شاعر شاعری کی گود میں پلا ہے۔ انورؔ کے ہم زلف شفاءؔ گوالیاری، اساتذۂ فن میں تھے۔ اور انہوں نے انورؔ کی شادی کے موقع پر ایک دلچسپ سہرا بھی کہا تھا۔ گویا بچپن سے لے کر جوانی تک انورؔ کا ماحول شاعرانہ تھا

اس ماحول نے ان کے ذوقِ سخن کو اتنا پختہ کر دیا کہ یہ ذوق وکالت جیسے پیشے سے بھی مجروح نہ ہو سکا۔ یوں بھی تخلیقِ فن کا مالی پیشے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بقولِ غالبؔ۔

پیشے میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

انورؔ کا مجموعۂ کلام "بوقلمون" صاف پتہ دیتا ہے کہ زبان و بیان پر انہیں پوری قدرت ہے۔ اور اپنے جذبات و افکار کو شعری پیکر دینے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ان کے کلام میں فکر کی دھوپ چھاؤں بھی ہے اور جذبات کا ارتعاش اور تموج بھی، لیکن بیان میں الجھاؤ یا ابہام نام کو نہیں ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی نے کہا تھا کہ:-

شعر در اصل ہیں وہی حسرتؔ — سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

انورؔ کا کلام شعر کی اس تعریف پر پورا اترتا ہے۔ بطورِ مثال چند اشعار دیکھئے

اب منزلِ ہستی کا انورؔ انجام نہ جانے کیا ہوگا
اک دوست کہ تھا ہمراہِ سفر کچھ دور چلا اور چھوٹ گیا

معاملہ لطف و کرم کا رکھا
واسطہ اس نے کچھ ایسا رکھا — ہم کو دنیا کا نہ اپنا رکھا

اپنی الفت میں گرفتار کیا — دل پہ ظالم نے عجب وار کیا

ہر ایک گلی انجانی سی ہر کوچہ ہے بیگانہ سا
اس دیس میں تیرا چاہنے والا پھرتا ہے دیوانہ سا

پھر بزم میں انورؔ آیا ہے تو کاش اسے پہچان سکے
باتیں بھی جنوں آمیز سی ہیں انداز بھی ہے رندانہ سا

چلے تو جائیں اس کی بزم میں پر غیر کے آگے — وہ ظالم جان کر ہم کو نہ پہچانا تو کیا ہوگا

چمن کی سمت ہی رکھ دو قفس کو موسمِ گل میں — یہیں سے دیکھ لیں گے ہم وہاں جانا تو کیا ہوگا

سوچتا ہوں میں کہ اس کافر ادا کے سامنے — ذکرِ غم آیا تو کیا حرفِ ملال آیا تو کیا

میں نے جو اپنی یاد دلائی تو یوں کہا

عاشق ہمارا کوئی بھی اس نام کا نہیں

کیا بتائیں اس بت کافر کی نظروں کا اثر

اک نظر دیکھا انہیں اک عمر دیوانہ رہے

آجائیں وہ تو دیکھئے پھولوں کی تازگی — وہ ساتھ ہوں تو رونقِ محفل کو دیکھئے

ایسی مغموم فضاؤں میں اٹھا کر ساغر — ہم نے تبدیلیٔ حالات کی دعوت دی ہے

موت کیا ہے صبحِ تازہ کی نمود — گو بظاہر زندگی کی شام ہے

قفس ہو کہ گلشن برابر ہے اس کو — جسے ہمتِ بال و پر ہی نہیں ہے

حُسن پر چھاتا ہے جس وقت جوانی کا نشہ

خود کہیں ہوتا ہے اور دھیان کہیں ہوتا ہے

اُٹھائی اور جھکائی بھی بس اک پل میں نظر اپنی

چلا کر تیر اک ظالم نے چپکے سے کماں رکھ دی

پھر یقیں اپنی محبت کا دلانے کے لئے

وہ قسم اپنی جو کھاتے تو غزل ہوتی ہے

آج پھر مست گھٹا جھوم کے اٹھی انور

آج تو پھر کوئی اچھی سی غزل ہو جاتے

جو ادا ہے کافرانہ جو نظر ہے قاتلانہ

کوئی کیا کرے پھر آخر جو نثار ہو نہ جاتے

تری بے رُخی نے ظالم وہ بجھا کے رکھ دیئے سب

جو چراغِ آرزو بھی مرے دل میں جگمگائے

یہ اشعار زبان و بیان اور معنی و مفہوم، ہر لحاظ سے سادہ ہیں لیکن ان کی سادگی میں ایسی پرکاری ہے کہ قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ مجھے یقین ہے کہ انور کے کلام کی تاثیر ہر صاحبِ ذوق کو اپنی طرف متوجہ کرے گی۔

فرمانؔ فتحپوری

۲۵ رمئی ۱۹۷۴ء
شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی

(۵)

تقریظ

ڈاکٹر سید یاور عباس
(ایم بی بی ایس)

سید انور علی انور ایڈوکیٹ میرے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ وضع قطع، رہن سہن، میل جول اور گفت و شنید میں سادگی کے ساتھ بردباری جو سادات کا حصہ ہے وہ انور علی صاحب میں بھی دیکھی۔ اور ان کے والد ماجد سید نور علی صاحب میں بھی پائی۔ اور ان کی اولاد بھی اس خوبی سے محروم نہیں ہے۔ غالباً ابتدائے ملاقات علاج معالجہ کے سلسلہ میں ہوئی۔ اور بعد میں ان کی وکالت میرے کام آئی اور میری ڈاکٹری ان کے ذہنی سکون میں کام آئی۔ پھر ان کے دادا صاحب قبلہ میر سید علی صاحب شاقؔ دہلوی مرحوم کے کلام پر بھی چند سطور لکھنے کی عزت میں نے پائی۔

اب انور علی صاحب کے کلام پر مجھے کچھ لکھنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ انور علی صاحب اکھاڑے کے شاعر نہیں ہیں چنانچہ کلام میں وہ بات بھی نہیں ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب نے غزل کے میدان میں پاؤں رکھ کر ہی نہیں بلکہ گھٹنے جما کر اپنی فطری سادگی کو غزل کی فنی پرکاری کے قریب قریب ضرور پہنچا دیا ہے۔ سید صاحب کی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کے بعد غزل سمٹ کر اپنے غم اور اپنے دل تک محدود ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ بھی ایک منزل ہے اور متبرک منزل ہے

میں سیّد صاحب کو یہی دوستانہ مشورہ دوں گا کہ غم کو محدود نہ کرو، وسعت دو اور غم حسینؑ کی بارگاہ تک لے جاؤ۔ شاعری رنگ دے جائے گی۔ اور یہ کیفیت اور حُسنِ تدبیر انور علی صاحب کے دادا صاحب مرحوم کے کلام میں موجود ہے۔ شاعری لوہار اور بڑھئی کا کام نہیں۔ یہ شیشہ گری ہے اور شیشہ میں یا تو شراب ہو یا پھر خونِ جگر۔

سیّد انور علی صاحب دہلی والے ہیں مگر کہیں کہیں زبان دہلی کی حدود سے باہر نظر آتی ہے۔ بہرحال یہ تبدیلی بھی آنی ہے اور آئے گی بعض غزلیں تو غزل کے مزاج میں ایسی رچی ہوئی ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔ مجموعی طور پر کلام میں شستگی بھی ہے۔ معاملہ بندی بھی ہے عشق کی چاشنی بھی ہے۔ خود آگہی بھی۔ مومنیت بھی۔ تھوڑی سی سیاست بھی اور خدا کا خوف بھی۔

۴ر فروری ۱۹۷۴ء

سیّد یاور عباس

(۴)

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں
ایم اے ایل ایل بی، پی ایچ ڈی
ڈی لٹ

بوٹم میری نظر میں

جناب انور کا مجموعۂ کلام میری نظر سے گذرا۔ وہ کسی مشاعرے کے شاعر نہیں اور نہ کسی کی واہ وا کے محتاج ہیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے محض اپنے مخلصانہ جذبات اور قلبی واردات سے مجبور ہو کر لکھا ہے۔ لیکن ان کا ماحول چونکہ ادبی تھا، بلکہ شعر و شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے اس لئے ان کے کلام میں فنی محاسن پائے جاتے ہیں اور وہ اچھا خاصا لکھ لیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

گذری ہے اہل دل پہ اک ایسی بھی کیفیت
لذت جو تھی کرم میں وہی تھی عتاب میں

مانوس ہو گئے تھے بس اک چارہ گر سے ہم
ورنہ تھا درد کو نہ تعلق دوا کے ساتھ

آدمی اتنا بھی کیا دنیا سے بیگانہ رہے
خم فسردہ سے رہیں دلگیر پیمانہ رہے

کیا جانے کہاں وہ پنہاں ہیں
اے شوق تری بن آئی ہے

جفا کو اگر ہم جفا ہی سمجھتے
محبت کی جلوہ نمائی نہ ہوتی

مدتوں ہم جانبِ شمس و قمر دیکھا کئے
ان کو جب دیکھا تو پھر حسنِ نظر دیکھا کئے

کچھ عجب حال ہے دل کا کہ وفورِ غم میں
اب ملاقات بھی فرقت نظر آتی ہے مجھے

بعض غزلوں میں کیف و سرور اور جذب و مستی کے جذبات شروع سے آخر تک ہیں۔ مثلاً ایک غزل اس طرح شروع ہوتی ہے :-

شوخی میں، دلبری میں، ستم میں، حیا میں حسن
چھلکے ہے مستِ ناز کی ہر اک ادا میں حسن

بعض غزلیں ان کی پختہ کاری اور فنّی مہارت کی شاہد ہیں۔ مثلاً ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں :-

ظاہر میں گو عیاں ہے حقیقت عیاں نہیں
یہ راز وہ ہے جس کا کوئی رازداں نہیں

سمجھو تو کائنات کی ہر شے پہ ہے محیط
دیکھو تو کوئی خالق و مالک یہاں نہیں

گذری تمام عمر یہی سوچتے ہوئے
جلوہ کناں وہ شوخ کہاں ہے کہاں نہیں

ان کے کلام کے متعلق اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سرتاپا دین اور بیوی کی محبت کا آئینہ دار ہے۔ اور جنابِ النور صرف اسی محبت کے قائل ہیں۔

حیدرآباد
۷ دسمبر ۱۹۷۴ء

غلام مصطفےٰ خاں

(۶)

پروفیسر ایف ایم شیخ
ایم اے

بوٹم ارتقاء کے آئینہ میں

غالب کا مشہور شعر ہے :-

سادگی و پُرکاری ، بے خودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

اس شعر کو سامنے رکھ کر جب میں سیّد انور علی انور کے مجموعۂ کلام "بوٹم" کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر غالب کے تخیّلِ حسن کو جناب انور کے "حُسنِ تخیّل" کا نام دے دیا جاتے تو شاید یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتے کہ اس مجموعۂ کلام میں جو ظاہری رنگ و بو کی کمی نظر آتی ہے، اس کے پس پردہ کتنی رنگینیاں اور کتنی رعنائیاں پنہاں ہیں۔ جناب انور کا سارا کلام پڑھ جایئے ، آپ کسی بھی مقام پر کوئی دقّت محسوس نہیں کریں گے مگر جب آپ شاعر کے وارداتِ قلب کا پس منظر ذہن میں رکھیں تو ان بظاہر سہل المعانی اشعار میں بھی کیف و گداز اور اضطراب و اضطرار کے ساتھ ساتھ اُمید و نشاط کی جھلک پائیں گے۔ قاری و ناقد کے لئے اس کلام کا یہی سب سے بڑا چیلنج ہے کہ وہ سطحِ آب پر خاموش اور سرد نظر آنے والی لہروں کی تہ میں ہیجان خیز تڑپ اور گرمیٔ نفس بھی محسوس کرتا ہے یا نہیں ! یہی سادگی میں پُرکاری اور بے خودی میں چھپی ہوئی ہوشیاری سیّد انور علی

کے کلام کا کمال ہے اور اسی حسن تغافل کی دریافت جرأت کی آزمائش ہے۔

جناب انورؔ نے اس مجموعۂ کلام "بوٹم" میں "میری شاعری" کے عنوان سے چند معروضات پیش کی ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری کا پس منظر اور بنیاد کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا یہ ارشاد محلِ غور ہے: "میں شاعر نہیں ہوں، اس لئے کہ مجھے اپنی شاعری پر کوئی اختیار نہیں۔ شعر مجھ پر ایک کیفیت کے ساتھ وارد ہوتا ہے اور جب تک یہ کیفیت نہ ہو، میرے لئے شعر کہنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ اس کیفیت کا کوئی وقت اور مقام نہیں ..... اس کیفیت کے پیدا ہونے کی دو وجوہات معلوم ہوتی ہیں، ایک وراثت اور دوسری وارداتِ قلب....."

وارداتِ قلب کا سرچشمہ جناب انورؔ کی زندگی کا وہ المناک اور یاس انگیز سانحہ ہے جو ان کی محبوب اہلیہ کے انتقال کی صورت میں پیش آیا اور جس نے ان کے جذبات میں غم انگیز یادوں کا سیلاب برپا کر دیا یہی جذبات زخمی دل کی ٹیس بن کر اور حرف و بیان کی آغوش میں آکر شعر کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ سیّد انور علی صاحب کے اس اعتراف یا اعتذار میں خلوص و دیانت کی جھلک تو پائی جاتی ہے مگر یہ باور کرنے کو دل نہیں چاہتا کہ یہ ہجر و وصال اور فراق کے صدمے محض کسی پیکرِ وفا کی ذات تک ہی محدود تھے (یا ہیں)۔ پیکرِ وفا یا مونسِ حیات تو دراصل ایک علامیہ یا سمبل SYMBOL ہے ان لطیف و نازک احساسات و جذبات کا جو شاعر کو غیر شاعر

سے متمیز و ممتاز کرتے ہیں، ورنہ دل اور غم کا تو نفس نفس کا ساتھ ہے۔
یہ دوسری بات ہے کہ جناب انور نے اپنے غم کو اپنی ذات میں سمو کر اسے انفرادی حیثیت (PERSONALISE) دے دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخصی وابستگی کی تہہ میں ان کے شعور کی مزاحمت بھی شامل ہے، وہ شعور جو خاندانی روایت، خانگی ذمہ داریوں، پیشہ ورانہ مصروفیتوں، فطری سادگی اور مذہبی لگاؤ کے متضاد اور بسا اوقات متصادم تقاضوں میں گھرا ہوا ہے۔ میں تو اسے بھی جناب انور کی فطری صلاحیتوں کا کمال سمجھتا ہوں کہ وہ کشاکشِ پیہم اور جہدِ مسلسل کے نرغہ میں گھرے ہونے کے باوجود ان مختلف سمتوں سے اُمڈ اُمڈ کر آنے والے احساسات و جذبات کو نہایت تحمل و سکون کے ساتھ نہ صرف اپنے دل میں سمیٹ لیتے ہیں بلکہ ان میں ہم آہنگی پیدا کر کے گوناگوں ذمہ داریوں کو بھی حسن و خوبی کے ساتھ نبھاتے جاتے ہیں۔ غالباً یہ اسی شانِ استغناء یا مصلحت بینی کا فیض ہے کہ انور صاحب ایک اعلیٰ پایہ کے وکیل بھی ہیں، علومِ اسلامی اور فلسفہ کے قابلِ قدر محقق و مصنف بھی، زاہدِ شب زندہ دار، اور ضم خانۂ شعر و ادب کے جُرعہ کش بھی!!

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

ارتقائی نقطۂ نظر سے جناب انور کا کلام زیرِ نظر مندرجۂ ذیل تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ابتدائی یا اوّل دور ۱۹۴۴ء تا ۱۹۵۵ء

(۲) دوسرا دور ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۰ء

(۳) تیسرا دور ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء

جناب انور کے اپنے بیان کے مطابق ان کی شاعری کے محرک اور اساس دو عوامل ہیں یعنی وراثت اور واردات قلب۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض وراثت نے ان کی فطرت میں شاعری کے لطیف احساسات ابتداء ہی سے ودیعت کر دیئے تھے اور جوں ہی موصوف نے عنفوان شباب میں قدم رکھا جذبات و احساسات کے خاموش تار یکایک جاگ اٹھے۔ ان کی خاموش اور مذہب و شائستگی سے مملو زندگی میں ایک انجانی سی خلش اور کسک انگڑائی لینے لگی۔ حمد و نعت اور نظموں کے علاوہ جو غزلیں اس دور کی ترجمانی کرتی ہیں وہ زیادہ تر ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء میں کہی گئی ہیں۔ یہ برصغیر کی سیاسی زندگی کا ہیجان خیز دور ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہی ممدوح کی جذباتی ہنگامہ آرائی کی ابتداء کا دور بھی ہے۔ اسی دور میں محبوب کا تصور دل میں ایک لطیف سی کسک پیدا کر رہا ہے۔ شریکِ حیات ایک ایسے تصوراتی محبوب کا سمبل بن گئی ہے جو مختلف روپ دھار کر کبھی سامنے آتا ہے اور کبھی تصور و تخیل کی حسین وادیوں میں جلوے بکھیرتا گذر جاتا ہے۔

زمانہ میں ہر سمت جلوے ہیں تیرے
تجھی سے تو یہ عالمِ رنگ و بو ہے

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ دردِ محبت کی شدت بھی تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔

جوشِ جنون میں چاکِ گریباں لئے ہوئے
وحشت میں پھر رہا ہوں بیاباں لئے ہوئے
پوچھتے کیا ہو مآلِ لذتِ عشقِ بتاں

آہِ دل، دردِ جگر اور نالۂ شب گیر ہے

۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۵ء تک کا کلام شاید قابلِ ذکر نہیں، اسی لئے موصوف نے اسے مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ذہنی آسودگی یا دیگر سمتوں میں انتہائی مصروفیت کا دور ہو، ایسا کہ واردات قلب سے بے نیازی میسر ہو۔ البتہ ایک غزل (یہ کس نے سامنے لاکر شرابِ ارغواں رکھ دی) اس بجھتی ہوئی چنگاری کو ہوا دیتی نظر آتی ہے جو اوائل شباب میں شعلہ بن کر ابھری تھی مگر اب امتدادِ زمانہ سے سرد ہو چلی تھی۔ اس غزل کے تیور صاف غمازی کر رہے ہیں کہ شاعر کے سینہ میں دل انگڑائی لے رہا ہے اور محبوب کا تصور، رفعت، لطافت کا نیا انداز اور نیا رنگ اختیار کر رہا ہے۔

اٹھائی اور جھکا بھی لی، بس اک پل میں نظر اپنی
چلا کر تیر اِک ظالم نے چپکے سے کماں رکھ دی

دوسرا دور۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۰ء

غزل کے نقطۂ نظر سے یہ زمانہ اوّل دور کا تسلسل ہے مگر غیر اختیاری احساسات کی فراوانی ہے۔ ان میں جذبۂ انسانیت کے فقدان اور مسلمانوں کی حالتِ زار پر کبھی دلسوزی اور کبھی طنز کے روپ میں بھرپور تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس دور کی بیشتر غزلوں میں چشم دابرد، ہجر و وصال اور اضطراب و اضطرار کے فطری جذبات سے یہی افسوس و شکایت کا رنگ متصادم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واردات قلب اور روایاتِ اخلاق و شائستگی کے درمیان ایک کشمکش جاری ہے۔ لاشعور میں ابھرنے والی رعنائیوں اور حسین و جمیل تصورات و تخیلات کی لہروں کو شعور کی

گراں بار چٹانیں بار بار روکنا چاہتی ہیں اور المیہ یہ ہے کہ شاعر ان کے سامنے بے بس ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان غزلوں میں نہ تو تسلسلِ خیالات ہی قائم رہتا ہے اور نہ تموّجِ جذبات! مستی و شوخی کے عالم میں بھی دنیا کی بے ثباتی اور اخلاقی اقدار کے زوال کا احساس دامن نہیں چھوڑتا بعض اوقات ایسی غزلوں میں وعظ و پند کا شدید غلبہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ ؎

اٹھتا ہے نقابِ رخِ جاناں کوئی دم میں
ہونے کو تباہی کا ہے ساماں کوئی دم میں
تسکینِ ہوسنا کیٔ فطرت کی طلب میں
انسان ہوا جاتا ہے عریاں کوئی دم میں
انورؔ ہجومِ لغزشِ عہدِ شباب میں
اک عمر ہوگئی کہ ہے دل پیچ و تاب میں

سب زندگی کے طور طریقے بدل گئے
اب ہے بدی کرم میں تو نیکی عتاب میں
دل سے مٹتا ہی نہیں ان کا خیال
ان سے کچھ ایسی محبت ہوگئی

آج ہے انسانیت، انساں پہ بار
آج یہ انسان کی قسمت ہوگئی

اخلاق و انسانیت کے میدان میں تو جناب انورؔ کی اضطرابی کیفیت آپ نے ملاحظہ فرمائی مگر اس دور میں کچھ ایسے حسین لمحات بھی ضرور آئے جب وہ نصیحت و پند اور فکرِ دنیا و عاقبت سے بے نیاز

ہو کر محض شاعر رنگین نوا کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ ایسی غزلیں ایک خاص کیف و نشاط کی حامل ہیں اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان حسین لمحات میں صرف شاعر کا دل کیفیت پذیر تھا یا فطرتِ شعر پسند کی ضیا باریاں کارفرما تھیں۔ دنیا و مافیہا کا دور دور تک پتہ نہیں۔ مثال کے طور پر یہ غزلیں

۱۔ خموشی بڑھ کے بن جائے گی افسانہ تو کیا ہوگا
اگر خود گونج اٹھا دل کا ویرانہ تو کیا ہوگا

۲۔ اک حسنِ ستم گر سے انور اظہار محبت کر بیٹھے
ہم اپنے ہی دل سے بے سمجھے یوں آپ عداوت کر بیٹھے

۳۔ یار جس وقت بھی پہلو کے قرین ہوتا ہے
وہی لمحہ تو حقیقت میں حسین ہوتا ہے

ان غزلوں کا انداز بظاہر یہ بتلا رہا ہے کہ شاعر کا دل پرسکون ہے۔ اور غم دنیا سے کوئی راہِ نجات دریافت کر لی گئی ہے مگر اس کے ساتھ خاموشی بڑھ کے افسانہ بن جانے کا خوف یہ غمازی بھی کر رہا ہے کہ شاعر کسی اندوہناک صدمہ سے دوچار ہونے والا ہے۔ ۱۹۷۱ء اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے ساتھ دستک دے رہا ہے ؎

اگر خود گونج اٹھا دل کا ویرانہ تو کیا ہوگا ؟ ! ؟

تیسرا دور۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۳ء

جناب انور کا تیسرا دور ان کی شاعرانہ زندگی کا حاصل Ebitome کہا جا سکتا ہے یہی ان کی زندگی کی پختگی کا دور بھی ہے یعنی ایسی زندگی جو اندوہ گیں اور کربناک تجربوں سے گذر رہی ہے جس میں ان کے ذاتی

عوامل بھی شامل ہیں اور وطنِ عزیز کی گردش و ابتلاء میں گھری ہوئی تاریخ بھی۔ اگر ایک طرف فلکِ ستم شعار نے ان کی وہ متاع کائنات چھین لی جو ان کی مصروفیتوں اور روایتی تکلفات سے لبریز زندگی میں لطافت و رعنائی اور رومانیت و دل بستگی کا مرکز تھی تو دوسری طرف ان کی چشمِ حقیقت پسند نے گرد و پیش کے حالات میں ابتری ہی ابتری دیکھی۔ حالات و سانحات کی شدت نے ان کی بظاہر مصلحت آمیز خاموش زندگی کے سکون کو درہم برہم کر دیا۔ اب جناب انور زندگی کے اس نازک اور کرب انگیز دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں جہاں نہ دل کو سکون و قرار میسر ہے اور نہ دماغ و ذہن کو آسودگی اور پر امیدی۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک شاعر کی زندگی اسی کرب و اضطراب سے ہی عبارت ہے خواہ اس کے محرکات و عوامل کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے مگر اس حقیقت کو کیا نام دیا جائے کہ جناب انور کے شاعرانہ فکر و عمل کا دائرہ مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اسی ایک دل میں رومانیت و جذبات انگیزی انگڑائی لیتی ہے اور اسی دل میں ملّت و انسانیت کے درد کی ٹیسیں بھی اٹھتی ہیں۔ اس دور کی بیشتر غزلوں میں "یادِ محبوب" کا رنگ غالب ہے جسے صحیح معنوں میں وارداتِ قلب کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دور کا الم انگیز ترین سانحہ جناب انور کی اہلیہ محترمہ کی وفاتِ حسرت آیات ہے۔ زندگی کے اس فطری انجام نے شاعر دل گرفتہ کے ذہن و دل کے تار پود کو اس بے دردی سے بکھیر دیا کہ دل کی اجڑی دنیا پھر نہ آباد ہو سکی۔

۷۲۔۱۹۷۱ء کا زمانہ جناب انور کے لئے شدید کرب و اضطراب

لے کر آیا۔ جس پیکر ناز کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی وہ کارکنانِ قضا و قدر کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئی۔ انہوں نے جذبات و احساسات کی یہ شمع نوریں اپنی آنکھوں کے سامنے لمحہ بہ لمحہ بجھتے دیکھی اور وہ بادِ فنا کے اس آخری جھونکے کو نہ روک سکے جس کی زد میں ان کے اپنے دل کی شمع حیات تھی۔ جب یہ آخری لو بھی بھڑک کر بجھ گئی تو جناب انور کے دل کی دنیا اتھاہ تاریکی میں ڈوب گئی اور وہ دیوانہ وار ریگ زار حیات میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیئے گئے۔ اس پر المیہ یہ ہوا کہ جب روایتی فراق کا خوف مستقل فراق میں تبدیل ہو گیا تو روز اوّل کی رجائیت نے بھی قنوطیت اور بے کیفی کی صورت اختیار کر لی۔ ان کا دل ایک ایسی کیفیت کا شکار ہو گیا جسے عرف عام میں حرماں نصیبی FATALISM کا نام دیا گیا ہے۔ اس دور کے کلام کا بیشتر حصہ اسی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے خواہ وہ اپنے دل کی کائنات اجڑ جانے کا غم ہو یا ملت اور انسانیت سے شکوہ کہ وہ کیوں اس قدر زوال پذیر ہو گئی۔ شدت احساس نے یہ گل کھلائے کہ دنیا کی ناپائیداری اور اقدار انسانی کے زوال پر فکر و نظر کے غلبہ سے جناب انور کا ذہن دنیا سے لاتعلقی اور عاقبت سے رشتہ کی استواری کی طرف جھک گیا۔ اس حسرت و یاس کے عالم میں بھی جب یادِ محبوب کی چبھن دل میں ٹیس لگاتی ہے تو جناب انور شدتِ کرب سے تڑپ اٹھتے ہیں۔ ؂

کیا دل کی بات کریں انورؔ، جب دل ہی اپنا ٹوٹ گیا
دل جس کے سہارے زندہ تھا وہ ساتھی ہم سے چھوٹ گیا

اسی غزل میں حرماں نصیبی کا رنگ بھی ملاحظہ ہو۔

کچھ فکر سے اپنی بن نہ سکا، سب عزم و عمل بے کار رہے
اک رہزنِ راہِ عشق ملا، اور صبر کی دولت لوٹ گیا

اور جب دل کی دنیا اُجڑ گئی تو ؎

ہر ایک گلی انجانی سی ہر کوچہ ہے بیگانہ سا
اس دیس میں تیرا چاہنے والا پھرتا ہے دیوانہ سا
اک تیری رفاقت سے دنیا گلزار تھی اپنی نظروں میں
اک تیرے جدا ہونے سے سنسار ہوا، ویرانہ سا

جذبات کی یہ ہنگامہ خیزی ۱۹۷۱ء اور اوائل ۱۹۷۲ء کے کلام میں پورے عروج پر ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح طوفان گذر جانے کے بعد فضا میں خاموشی اور ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح وقت گذرنے کے ساتھ جناب انور کے جذبات میں بھی ایک قسم کا ٹھہراؤ اور حالات سے سمجھوتہ کر لینے کا انداز پیدا ہو گیا۔ اس کیفیت کو ہم CATHARSIS (شدتِ جذبات کے بعد آسودگی) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ محبت کی دنیا میں محبوب کا تصور جتنا آفاقی اور تشخص کے دائرہ سے جس قدر وسیع ہوگا اس کے لئے دل کی وابستگی اور تڑپ اسی نسبت سے شدید اور وقت کی گرفت سے محفوظ ہوگی۔ اس کے مقابلہ میں جناب انور کا محبوب تشخص کے دائرے میں سمٹ کر رہ جانے سے محبت کا مظہر ہونے کے باوجود فردِ مخصوص کی فکر اور وابستگی کا محور ہی رہا۔ اور جب وہ پیکرِ ناز و ادا قانونِ قدرت کی زد میں آکر اپنی ہستیٔ مشاہدہ پرور سے گذر کر عالم غیر مرئی میں منتقل ہو گیا تو جوں جوں وقت اور فاصلہ درمیان میں آتا گیا

اس کے نقوش کا تیکھاپن اور اس کے وجود کی گرمی کا احساس بھی رفتہ رفتہ ذہن و نظر سے دور ہوتا گیا۔ چنانچہ ۱۹۷۳ء اور اس سے قریب تر ۱۹۷۲ء کے کلام میں وہ گرمی اور تڑپ نہیں رہی جو ۱۹۷۱ء کے اس دور میں نمایاں ہے جب ان کی ازدواجی (اور جذباتی) زندگی میں وہ کرب ناک سانحہ پیش آیا تھا اور جس نے جناب انور کے جذبات و احساسات کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ۱۹۷۳ء کا کلام اس بات کا شاہد ہے کہ شاعر کے جذبات میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔ اسے سرد مہری اور بے اعتنائی تو نہیں کہہ سکتے مگر اتنا ضرور ہے کہ اب حالات سے سمجھوتہ کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ اب وارداتِ قلب کبھی کبھی یاد ماضی میں لے بھی جاتے ہیں تو صدائے بازگشت کی جھنکار سے لطف اندوز ہونے کی خاطر!

ہجر کی راتوں میں اکثر یاد آجاتے ہو تم
ادراک خوابیدہ حسرت کو جگا جاتے ہو تم
ایک مدت ہو گئی ترکِ تعلق کو مگر
آج بھی احساس کی دنیا پہ چھا جاتے ہو تم
اب تو انور ہے خاموشی ہی مناسب ورنہ
عرضِ غم میں تو بہت خطرۂ رسوائی ہے

جناب انور نے یار کی جدائی سے بے ثباتی دنیا کا تاثر لیا اور عبرت پذیری کی طرف دل مائل ہو گیا۔ زہد و تقویٰ طبیعت پر غالب آگیا اور عاقبت کا اندیشہ دامن گیر ہو گیا۔

بگڑ کر رہ گئے اعمال اور ایمان کھو بیٹھے
اگر پایا تو یہ پایا شیاطین کی رفاقت میں

صاحبِ ادراک ہے انساں وہی اے دوستو
عیش میں جو گردشِ ایام سے غافل نہ ہو

جہاں تک جناب انور کی شاعری کا تعلق ہے، ان کا تمام تر کلام بے ساختہ اور پرجوش وارداتِ قلب پر مبنی ہے۔ یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے اور اس بنیاد پر وہ تنقیدی گرفت سے نسبتاً محفوظ بھی ہیں۔ کلام میں بے ساختگی اور تصنع سے دامن کشی ان کے ہر شعر سے عیاں ہے۔ اگر اس میں کہیں ربط و تسلسل کی کمی پائی جاتی ہے تو اس کی وجہ محض یہی ہے کہ واردات کا عمل ان کے اختیار سے باہر ہے۔ زمان و مکاں کے لامتناہی میدان میں کوئی بھی نقش ابھر سکتا ہے! ان معنوں میں جناب انور واقعی خوش قسمت ہیں کہ ان کی عروسِ شعر گوئی کی مشاطگی پیکرِ فطرت کے ہاتھوں ہوئی ہے جس نے ان کے وارداتِ قلب کا رنگ نکھارنے کے لئے ان کے دامن کو گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا ہے۔ یہ مرقع مجموعۂ کلام کی صورت میں "بوٹم" ہے۔ جو اپنی فطری دلکشی و رعنائی میں حساس و باشعور دل و دماغ میں وارد ہونے والے سادہ و رنگین احساسات و جذبات کا صحیح معنوں میں آئینہ دار بھی ہے۔ اور اردو ادب میں ایک اچھوتا اضافہ بھی۔

ایف ایم شیخ

ناظم آباد۔ کراچی
۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء

(۷)

سیّد انور علی انورؔ کی شاعری کا رنگ

پروفیسر فیاض احمد خاں کاوشؔ

اس رنگ بدلتی دنیا میں ہر چیز پر ایک رنگ آتا ہے۔ ایک رنگ جاتا ہے۔ رنگوں کا تموج ہی زندگی کا خاصہ ہے۔ تغیرِ رنگ کا عمل تو موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ہر 'کیفیت'۔ کا اپنا ایک 'رنگ' ہوتا ہے اور ہر "جذبہ"۔ اپنے 'رنگ' سے پہچانا جاتا ہے۔ رنگوں کے اس امتزاج ہی سے زندگی عبارت ہے۔ لیکن انسانی جذبات پر درد و غم کا رنگ سب سے زیادہ غالب نظر آتا ہے۔

زندگی کا چہرہ درد و غم سے نکھر جاتا ہے۔ "خلوص" سے اس رنگ میں چمک آتی ہے اور۔ "محبت"۔ اس رنگ کو بقائے دوام بخشتی ہے!! چنانچہ جس شاعرِ خوش نصیب کو یہی رنگا رنگ نعمتیں نصیب ہوتی ہیں اس کی شاعری زندۂ جاوید ہوکر، ابدالآباد تک 'رنگ و نور' برساتی رہتی ہے۔

یہی رنگ و نور ہے جو انور علی انورؔ کے کلام میں جھلمل جھلمل کرتا نظر آتا ہے۔ انورؔ کے کلام میں یہی سچی، پاکیزہ اور روحانی۔ "محبت"۔ ہی ہے جو "غم" کا گہرا رنگ لئے ہوئے "اخلاص" کا نور برسا رہی ہے اسی خلوص کی تاثیر ہے کہ ؎

شبِ فراق کے لمحے بھی اہلِ دل کے لئے

فروغ جذب محبت، حصول راحت جاں

اور فروغ جذبِ محبت ہی کا اثر ہے کہ ؎

ہر رات ہجوم غم میں ہی اک ایسا وقت بھی آتا ہے
جب ہاتھ سے اپنے اُن کے میں بالوں کو سنوارا کرتا ہوں

چنانچہ اسی "اخلاص" کی بدولت محبت میں 'ہجومِ غم' بھی باعث تسکینِ دل بن جاتا ہے۔

بہت سکون، غمِ عاشقی میں پایا ہے
ابھی کچھ اور غمِ عاشقی کی بات کرو!

لیکن یہی شدتِ غم، ہجرِ یار میں تلوار کی کاٹ بھی بن جاتی ہے چنانچہ:۔

؎ جینا کسی کے ہجر میں دشوار ہو گیا
ہر سانس ہم کو زیست میں تلوار ہو گیا

اور پھر اس تلخ کلامی کا رنگ اس قدر گہرا ہو جاتا ہے کہ جب کبھی ؎

ٹکرائیں وہ نظریں تو ہوالیوں محسوس
نشتر کئی جیسے رگِ جاں تک پہنچے

اور جب وصلِ یار حاصل ہوتا ہے تو بندِ غم بیساختہ ٹوٹ جاتا ہے ؎

ملتے ہی گلے یار سے یوں ٹوٹ کے برسی
اشکوں کی گھٹا جیسے برسنے کو کھڑی تھی

شاعرِ رنگین بیان نے خیالات کی وارفتگی اور جذبات کی بیساختگی کو کیسا رنگین جامہ پہنایا ہے۔ درحقیقت ایسی شاعری کی نہیں جاتی ہو جایا کرتی ہے۔ ایک اور جگہ ذرا حسن کی رنگ آمیزی تو ملاحظہ فرمائیے

؎ ترا حسن آنکھوں میں کیا بس گیا ہے

جسے دیکھتے ہیں جواں دیکھتے ہیں

یہی سب محبت کی رنگینیاں ہیں۔ ذرا وفورِ شوق کی اثر آفرینی ملاحظہ فرمائیے

گو کوئی وعدہ نہ تھا لیکن نہ جانے کس لئے
آپ آنے کو ہیں بس یہ ہر گھڑی سمجھے تھے ہم

دراصل یہی سب "اخلاص" کی کارفرمائی ہے محبوب کی تو ہر چیز محبوب ہوتی ہے چنانچہ غمِ محبوب بھی عاشق کو محبوب ہو جاتا ہے ؎

تجھ کو میں اے غمِ محبوب بھلا دوں کیوں کر
تجھ سا دنیا میں کہاں مونسِ تنہائی ہے

اسی لئے عاشق اسے اپنی متاعِ زندگی بنا لیتا ہے انتہا یہی ہے کہ ؎

اپنا سب کھو کر بھی کچھ احساسِ محرومی نہ تھا
آپ کے غم کو متاعِ زندگی سمجھے تھے ہم

بھلا غم کو انور متاعِ زندگی کیوں نہ سمجھتے کہ وہ ادا شناسِ عشق ہیں ـــــ جی ہاں !!

سمجھ رہا ہوں تری ہر ادا کی رنگینی
مرے خیال سے نفرت ہو یا بیاں سے گریز

عاشقِ صادق ہونے کی حیثیت سے انور رنگینیٔ ادائے محبوب کے رمز شناس ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ؎

اسی ادا میں نہاں اعترافِ عشق بھی ہے
وہی ادا جو بظاہر ہے داستاں سے گریز

انور کی یہ پوری غزل مرصع ہے اور اداۓ ناز کی رنگین تصویر ہے

سید انور علی انور دراصل فطری طور پر

شاعر ہیں۔ انسانی احساسات اور فطری جذبات کی ترجمانی پر قادر ہیں خصوصاً عشق و محبت کی رنگین واردات کا تجزیہ نہایت دل نشیں انداز میں پیش کرتے ہیں۔

درد و اثر سید انور علی انورؔ کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔

شاہ عبداللطیف گورنمنٹ کالج
میرپور خاص
فیاض احمد خان کاوش

۱۱ر جنوری ۱۹۷۷ء

(۸)

جائزہ

محمد وفی خاں یوسف زئی
ایم اے ایل ایل بی
(ایڈووکیٹ)

زیرِ نظر کتاب "بوٹم" ہر صنفِ شاعری پر محیط ہے یہ حمد و نعت، مرثیہ، غزلوں، نظموں اور قصیدوں کا مجموعہ ہے۔ بوٹم کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ سید انور علی صاحب انور شعراء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے نزدیک زندگی ایک حقیقت ہی نہیں حسین حقیقت ہے۔ کلام و بیان کی پُرخلوص سادگی اسی حسین حقیقت کی غماز ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو شاید بوٹم کا شاعر بے ساختگی کے ساتھ اپنے جذبات و کیفیات کا اظہار اس قدر بے اختیار ہو کر کبھی نہ کرتا۔ خود شاعر نے "اپنی شاعری" کے بارے میں غیر مبہم الفاظ میں جس سچائی کا اعتراف کیا ہے وہ اسی لطیف جذبے کا اظہار ہے۔ فرماتے ہیں :-

"میں شاعر نہیں ہوں اس لئے کہ مجھے اپنی شاعری پر کوئی اختیار نہیں۔ شعر مجھ پر ایک کیفیت کے ساتھ وارد ہوتا ہے اور جب تک یہ کیفیت نہ ہو میرے لئے شعر کہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے ۔۔۔۔۔ اس مجموعہ کی تمام غزلیں اور نظمیں اسی کیفیت کی مرہونِ منت ہیں جو کچھ میں نے عرض کیا یہ ایک حقیقت ہے"۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیفیت کیا ہے!

بقولِ شاعر وہ "وارداتِ قلب" ہے۔ یعنی وہی "جنونِ عشق" "غمِ آرزو"

"قلب تپاں" جو دلِ دردمند میں "آہِ تاب شکن" بن کر دوسرے بہت سے دلوں میں سوتیاں چبھونے لگتا ہے۔ اس کیفیت کا اظہار خود شاعر نے یوں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

رفیقِ راہِ محبت ہیں دیکھئے کیا کیا
جنونِ عشق غمِ آرزو و قلبِ تپاں

یا

پوچھتے کیا ہو مآلِ لذتِ عشقِ بتاں
آہِ دل دردِ جگر اور نالۂ شب گیر ہے

یا

گاہے گاہے اشک برسا کر کسی کی یاد میں
خود غبارِ غم کو اپنے آپ دھو جاتا ہے دل

یا

دے کر غمِ فراق بڑھایا ہے جذبِ عشق
ناکامیوں کے بعد جنوں شاد کام ہے

یا

فرقتِ خورشید میں انور یہ ہوتا ہے گماں
جیسے دنیا واقعی سنسان ہو کر رہ گئی

اور سچ پوچھیے تو دل کی یہی ویرانی شاعری کو جلا بخشتی ہے۔

غرض جنونِ عشق و محبت اور اس کے جذبات و کیفیات کی بھرپور جھلک آپ بوٹم کی ہر غزل میں دیکھ سکتے ہیں مگر صاحبِ دیوان کے نزدیک یہی سب کچھ نہیں ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں سے بھی آشنا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ اس کی شاعری کا مرکزی مضمون زندگی ہے۔ مگر خود زندگی کیا ہے! اس کی تعبیر انور صاحب کے ہاں بھی وہی ہے جو جدید شاعروں کے باشعور گروہ کے نزدیک عام طور سے تسلیم شدہ ہے یعنی مسلسل عمل اور مستقل جدوجہد۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو انور صاحب شاعری کے علاوہ اور کچھ نہ کر رہے ہوتے۔ ویسے بھی ایمان کی بات تو یہی ہے کہ شاعری اور پیشہ میں کوئی نسبت نہیں۔ غالب نے ایسے ہی موقع پر نکتہ والی یہ بات کہی ہے۔

پیشے میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا (غالب)

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بوطم کا شاعر زندگی کی حدود کے بارے میں قطعی مطمئن نہیں۔ اس کی بے چین نظر جو بصیرت کے ساتھ فکری اور ذہنی ذوق و شوق کی حامل ہے، زندگی کی نامعلوم وسعتوں پر چھا جانا چاہتی ہے۔ یہ وسعت کی آرزو شاعر کے احساسات اور کیفیات کی تہہ میں اس شدت سے موجزن ہے کہ یہی اس کی ساری شاعری میں رواں دواں معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ کیجئے:-

ظاہر میں گو عیاں ہے حقیقت عیاں نہیں
یہ راز وہ ہے جس کا کوئی راز داں نہیں

سمجھو تو کائنات کی ہر شے پہ ہے محیط
دیکھو تو کوئی خالق و مالک یہاں نہیں

یا

بندگانِ ناز زندہ ہیں تو وہ کافر ادا

دیکھتے ہی دیکھتے اک دن خدا بن جائے گا

کر دیا ساقی نے کم ظرفوں کے میخانہ سپرد
مے پہ کیا گذرے نہ جانے جام کیا بن جائے گا

یا

پتھر کی ایک سادہ عمارت کو دیکھئے
ان کی نگاہِ لطف نے کعبہ بنا دیا

یا

ہے دیکھئے تو گوشۂ دل میں مرے مکیں
وہ حسن جو نہ کون و مکاں میں سما سکا

ہم ہی نے اختیارِ عمل کا کیا قبول
یہ بار وہ ہے جو نہ فلک بھی اٹھا سکا

غرض اسی قسم کے اور بے شمار اشعار انہیں کیفیات کے حامل ہیں جو شاعر کو اس کی بے چین نظر کی وسعتوں کی بنا پر زندگی کے محدود دائرے میں مقید نہیں رہنے دیتے۔ چنانچہ وہ سیمابی کیفیت میں مبتلا ایک ایسے انقلاب کا خواہش مند نظر آتا ہے جو مختلف اطراف سے انسان کی فکری دنیا کو یکسر بدل دے۔

بلاشبہ پچھلے کچھ عرصہ سے جو خاموش ذہنی انقلاب رونما ہو رہا تھا، آج اس کے نتائج اور اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔ بوطم کا شاعر اسی خاموش ذہنی انقلاب سے متاثر نظر آتا ہے۔ آج اور گذرے ہوئے کل کے درمیان ذہنوں کی مسافت داخل ہو چکی ہے۔ اس ذہنی انقلاب نے ذہن، عقل اور انسان کے باہمی رشتہ کو مضبوط تر کر دیا ہے۔ اور

جس ذہنی انقلاب نے ہمارے ماحول اور اردگرد کی طرف توجہ دلائی ہے اسی ذہنی انقلاب نے یہ بھی کہا ہے کہ معاشرہ انسانی زندگی کا ضامن ہے چنانچہ پچھلے کچھ برسوں سے جس قسم کی شاعری سامنے آرہی ہے وہ اسی ذہنی انقلاب کی پیدا کی ہوئی ہے۔ بوٹم کا شاعر اسی ذہنی انقلاب کا ایک نمائندہ ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ انور صاحب کی شاعری شعوری یا غیر شعوری طور پر اس انقلاب سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔

ایسے بھی کچھ ہوتے ہیں یہاں صاحبانِ عزم
جن کو ذرا نہ بازوئے باطل دبا سکا

یا

کب چھپے گی وہ نگاہوں سے مری
لاکھ پردے ڈالئے تصویر پر

یا

طوفاں میں خوف بادِ مخالف کا کس لئے
مڑ مڑ کے اب نہ کشتیِ ساحل کو دیکھئے

یا

لالہ و گل ہی نہیں مہر و مہ و انجم نے
فکرِ انسان کی تجلّی سے ضیاء پائی ہے

یا

جن کی ہر اک ادا پہ ہے خود لامکاں کو ناز
ایسے بھی لوگ عالمِ امکاں میں آ گئے

بوٹم میں پیش لفظ، تعارف و تبصرہ، تقریظ و تنقید سبھی کچھ

شامل ہیں مگر درحقیقت "میری شاعری" میں سید انور علی صاحب انور نے خود اپنی شاعری کے محرکات کا جس تفصیل سے ذکر کر دیا ہے وہی سب کچھ ہے۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے جس خلوص کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ انہوں نے پوری دیانت داری سے کام لیا ہے اور یہ بات بڑی خود اعتمادی کی ہے۔ ہم صاحبِ بوٹم سے یہی گذارش کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باوجود صنفِ شاعری کے دامن کو اپنے لعل و گہر سے پُر کرنے کی بھرپور کوشش کرتے رہیں گے اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر یہ ہوگا کہ بقول انیس مرحوم :-

انیس یوں ہوا حالِ جوانی و پیری
بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

(میر انیس)

کراچی
۵ر اپریل ۱۹۷۵ء

محمد وفی خاں یوسف زئی

(۹)

سید مکرم علی سیفی ندوی فرید آبادی
(ایڈوکیٹ)

تاثر

جناب سید انور علی صاحب انور پیشہ ور شاعر نہیں۔ لیکن خاندانی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کسبی نہیں ودیعی ہے۔ انور صاحب کے دادا مرحوم حضرت شائق دہلوی صاحب دیوان ہوتے ہیں دہلی کے معتمد شعراء میں شائق صاحب کا شمار ہوتا تھا۔ انور صاحب کے والد صاحب قبلہ حضرت شوق بھی خوب کہتے ہیں۔

انور صاحب کے دیوان کی وجہ تسمیہ انتساب کی چند سطور سے واضح ہی نہیں بلکہ دردِ دل رکھنے والوں کے قلوب پر مرتسم ہو جاتی ہے اسی نسبت سے انور صاحب کے کلام کی برجستگی، احاطہ احساسات اور مظاہرۂ جذبات درحقیقت واردات قلب کے مرہونِ منت ہیں۔ خود بقول انور کہ ان کی شاعری ضرورتِ شعری کا تکملہ نہیں۔ شعر ان پر ایک کیفیت کے ساتھ وارد ہوتا ہے اور جب تک یہ کیفیت نہ ہو ان کو شعر کہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

انور صاحب کا کلام انور صاحب کے اس قول کی جیتی جاگتی شہادت ہے۔ کیفیات اختیاری نہیں اضطراری ہوتی ہیں اور ہر قلب پر وارد ہوا کرتی ہیں۔ ان کو صحیح الفاظ دے کر جذبات و کیفیات کی تصویر کشی کرنا کمال فن سخن ہے۔

میں نے انور صاحب کا دیوان جستہ جستہ دیکھا۔ ہر شعر نے انور صاحب کے صاحبِ فن ہونے کا زبردستی اعتراف کرا لیا۔ اس زبردستی سے متاثر ہو کر طبیعت حاضرہ نے چند اشعار سامنے رکھ دیئے جو ہدیۂ تبریک کے نام سے انور صاحب کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

ہیچمدان ازلی سیّد مکرم علی سیفی فریدآبادی

۷ رجولائی ۱۹۷۴ء

ھدیۂ تبریک

دیوان کلامِ نغزِ انور
لیلائے کمالِ فن کا زیور

احساس کی بے پناہ موجیں
جذبات کا بیکراں سمندر

ہر لفظ میں سینکڑوں فسانے
ہر حرف میں داستاں مضمر

خورشیدِ جمالِ آرزو کا
ماضی ہے بحالِ خود مصوّر

اک شمعِ وفا بجھی بجھی سی
سیلی زدۂ غرورِ صرصر

بوٹم کہ ہے معنونِ فسانہ
ممکن ہے ملے بروزِ محشر

کحلِ بصرِ سخن ہے سیفی
نزدِ سنِ نظرِ کلامِ انور

(۱) تبصرے اور خطوط

۴۷ جی ماڈل ٹاؤن

۲۵/۱/۷۵ لاہور ۱۴

مکرم۔ سید انور علی صاحب سلام قبول کریں

یہ عجیب بات ہے۔ آپ کے مجموعۂ کلام پر مجھے کچھ لکھنے کے دو تین خطوط کے بعد میں نے کتاب کا مسلسل مطالعہ کیا تھا اور تین صفحے کا ایک مضمون آپ کی خدمت میں ارسال کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ یہ ملفوف تحریر جو ذرا کٹی پھٹی تھی۔ میں نے اسے خود صاف نقل کرنے کی بجائے آپ کو یہ لکھا تھا کہ اس پر نظر ڈال لیں۔ کوئی لفظ پڑھا نہ جاتے تو مجھ سے پوسٹ کارڈ لکھ کر پوچھ لیں۔ اسے دو مہینے قبل اپنے ہاتھ سے سپرد ڈاک کرنے کے بعد میں مطمئن تھا کہ آپ مطمئن ہو گئے ہیں۔ لیکن آپ کا یہ ۶ جنوری کا خط بتا رہا ہے کہ آپ کو یہ اظہار رائے ملا ہی نہیں۔ سید صاحب! میں نے انتہائی غور و فکر سے یہ مضمون لکھا تھا۔ میں بہت بیمار اور ساتھ ہی آتے دن اپنے پرانے دوستوں کی خبر ہائے مرگ پر سوگوار ہوں۔ شعر و شاعری کا دور جا چکا ہے۔ آپ کے اشتیاق کی تعمیل کر دی گئی تھی۔ آپ کی زوجہ مکرمہ سے یہ محبت ایک مثالی کیفیت نظر آئی کہ آپ نے ساری زندگی کے عطر کا نام "بوٹم" قرار دیا جو آپ کی شاعری کی روح میں خوشبو دے رہا ہے۔ افسوس اب مجھ سے دوبارہ نہ لکھا جا سکے گا۔ آپ اپنے دفتر کے کاغذات میں تلاش کیجئے۔ شاید مل جائے۔

والسلام۔ خادم

حفیظ جالندھری

مکرمی و محترمی ۔ آپ کی دونوں کتابیں پہنچیں ۔ اس عنایت کا شکریہ "بوٹم" کو میں نے دیکھ ڈالا ہے ۔ البتہ انگریزی کی کتاب کا تا حال مطالعہ نہیں کر سکا۔

آپ کے اردو کلام میں اخلاص اور شگفتگی نمایاں ہے زبان پر آپ کو قدرت ہے ۔ اور اندازِ بیان میں ایک خاص روانی ہے اور ذاتِ رسالت سے جو عقیدت آپ کے اشعار میں جھلکتی ہے ۔ اس کی داد تو وہی دے گا ۔ جس کا حق ہے ۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

آپ کی نوازش کا دوبارہ شکریہ ۔ میں یہ دونوں کتابیں پڑھ چکنے کے بعد رفعت سلطانہ کلکشن میں جمع کروا دوں گا ۔ جسے میں نے پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں اپنی مرحوم بچی رفعت سلطانہ کے نام پر جمع کر رکھا ہے اس وقت تک اس ذخیرے میں تقریباً نو ہزار کتب فراہم ہو چکی ہیں ۔

والسلام ۔ مخلص

ممتاز حسن

بخدمت شریف جناب سید انور علی صاحب
۲۰۶ لائنز چیمبرز بندر روڈ ۔ کراچی

(۲) چک نمبر ۱۵ شمالی۔ ڈاک خانہ چک نمبر ۵

براہ ملکوال۔ ضلع گجرات پنجاب ۲۷ فروری ۱۹۷۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشفقم سیّد صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

صدیقِ محترم پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب کی معرفت "بوٹم" مطالعہ کے لئے موصول ہوئی ہے۔ میں بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ ادھر چند سال میں جو شعری تخلیقات منظرِ عام پر آئی ہیں "بوٹم" ان میں امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔

سیّد صاحب سخن گوئی کو ثانوی حیثیت نہ دیں ممکن ہے کہ آپ کی دوسری تمام انگریزی اور اردو تصانیف دھری کی دھری رہ جائیں اور صرف اکیلی "بوٹم" ہی آپ کو حیاتِ جاودانی نصیب کرے۔

بہن خورشید کی موت سے آپ پر جو گذرا سو گذرا لیکن وہ شعر و ادب کی دنیا کو "بوٹم" کی شکل میں بہت کچھ دے گئی ہیں۔ "بوٹم" کا ہر قاری اپنے آپ کو مرحومہ کے لئے صدقِ دل سے دعائے مغفرت کرنے پر مجبور پائے گا انشاء اللہ العزیز اس کے علاوہ اور کیا عرض کروں کہ مندرجہ ذیل اشعار اپنے خالق (مجازی طور پر) کو امر بنانے کے لئے کافی ہیں۔

ہو نہ ہو آباد لیکن ہر زمین شعر میں
اشک کے دانے بڑی حسرت سے بو جاتا ہے دل

کھو چکے تو کچھ ہمیں قیمت کا اندازہ ہوا
آہ وہ اک عمر جس کو رائگاں سمجھے تھے ہم

دے سکے گا ساتھ اپنا تو نہ اک دو گام بھی

تجھ کو اے جانِ جہاں ایسا کہاں سمجھے تھے ہم

ہو چکا دل خون کسی کا جب تو وہ کافر نظر
کس قدر معصوم کیا انجان ہو کر رہ گئی

چھوٹا جو حرم کوئے بتاں تک پہنچے
بھٹکے تو پھر انسان کہاں تک پہنچے

تھے راہ پہ جب تک تو یقین تھا کامل
بھٹکے تو فقط وہم و گماں تک پہنچے

ٹکرائیں وہ نظریں تو ہوا یوں محسوس
نشتر کئی جیسے رگِ جاں تک پہنچے

ایسے لافانی اشعار "بوٹم" کے صفحات پر جا بجا بکھرے ہوتے ہیں امید ہے کہ "بوٹم" کا آئندہ ایڈیشن ضخامت میں کافی زیادہ ہوگا۔

والسلام آپ کا مخلص

سید نور محمد قادری

---

(۳)

ہماری منزل

۱۴۔ محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی

کراچی ، ۸ جولائی ۱۹۷۴ء

مکرمی ، سلام مسنون

نوازش نامے کا اور آپ کے مجموعۂ کلام کا تہہ دل سے شکریہ ، کل اتوار تھا اور مجھے آپ کے اشعار سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔

اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

آپ کے کلام میں آپ کی شریکِ حیات کا سایہ جا بجا نظر آتا ہے ۔

مرحومہ خوش نصیب تھیں کہ آپ جیسا چاہنے والا انہیں ملا، وہ آپ کے اشعار میں زندہ رہیں گی، بقولِ جناب سیماب اکبرآبادی :۔ ؎

میں بعد مرگ بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر میری محفل مرا مزار نہ پوچھ

آپ کو شعر کا ذوق تو ورثے میں ملا لیکن آپ کے شوق نے اسے اور اجاگر کر دیا آپ کے اشعار میں غزل کی روح برقرار رہی، میری دعا ہے کہ

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

مخلص ہاشم رضا

جناب سیّد انور علی صاحب انور
کراچی

جناب مکرم :

السلام علیکم

آپ کے مجموعہ کلام (بوٹم) کا جستہ جستہ مطالعہ کیا، آپ کا اخلاص اور سوزِ دل آپ کے شعروں میں "آبِ گہر" کی طرح سمویا ہوا ہے، آپ کے اشعار تخیلی کم اور واقعاتی زیادہ ہیں، "واقعیت" سے شاعری میں اور زیادہ حسن اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ پھر دین و اخلاق سے آپ کو جو شغف ہے اس کی جھلکیاں بھی آپ کے کلام میں ملتی ہیں! جزاک اللہ

آپ کو اپنی مرحومہ بیوی سے جو والہانہ محبت تھی، وہ معاشرے کے لئے بہت اچھی مثال ہے، یہ آپ کی شرافتِ نفس کی دلیل ہے۔ ورنہ آج کی سوسائٹی میں عام طور پر گھریلو زندگیاں بے لطف ہیں، آئے دن بدمزگیاں

پیدا ہوتی رہتی ہیں، یورپ کا حال اور بدتر ہے۔

جہاں تک زبان و فن کی خامیوں کا تعلق ہے اس سے کوئی شاعر محفوظ نہیں ہے میں اپنے چھپے ہوئے شعری مجموعوں کو پڑھتا ہوں تو اپنی کوتاہیوں پر ندامت ہوتی ہے، آپ کے کلام میں بھی لغزشیں ہیں مگر آپ کے کلام کی خوبیوں سے صرفِ نظر ممکن نہیں:۔

آجائیں وہ تو دیکھئے پھولوں کی تازگی
وہ ساتھ ہوں تو رونقِ محفل کو دیکھئے

انورؔ جو دم ہے اس کو غنیمت ہی جانئے
کچھ اعتبار اب سحر و شام کا نہیں

وہی مقام تو ہے روحِ داستاں اے دوست
بیانِ عشق میں تو نے کیا جہاں سے گریز

اب نہ دے مجھ کو صلائے شادمانی، ہم نشیں!
زندگانی کا مزہ گھٹ گھٹ کے مر جانے میں ہے

صدا اک طائرِ بسمل کی کیا پہنچے گی گلشن تک
اسیرانِ قفس آؤ کہ ہم آواز ہو جائیں

اس قسم کے اشعار ہر صاحبِ ذوق سے دادو ستائش حاصل کریں گے۔

والسلام:

خیراندیش۔ ماہر القادری

۱۰/اپریل ۱۹۷۴ء

شاعر :- سیّد انور علی انوؔر

پتہ :- سیّد پبلیکیشنز ۲۰۶ لائرز چیمبرز بندر روڈ۔ کراچی

سیّد انور علی انوؔر پیشہ ور شاعر نہیں ہیں بلکہ قانون کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ لیکن قدرت نے انہیں شعری تخلیق کی صلاحیتوں سے نوازا ہے چنانچہ اس شعری مجموعے میں ان کی جو نعتیں غزلیں اور نظمیں پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ ان میں تنوع اور تاثیر کے پہلو نمایاں ہیں۔ مولانا ماہر القادری کے پیش لفظ، ڈاکٹر محمد مسعود احمد، ڈاکٹر فرمانؔ فتحپوری اور ڈاکٹر سیّد یاور عباؔس کے تعارفی مقالات اور تبصروں کے ساتھ سیّد انور علی ایم اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ کا یہ پہلا مجموعۂ کلام مناسب کتابت وطباعت کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اور مبصرین نے اس شعری مجموعہ کی فکری و نظری اور اسلوبِ بیان کی خصوصیات پر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔

شعری مجموعے کے نام کی نسبت شاعر کی اس والہانہ محبّت سے ہے جو انہیں اپنی مرحومہ بیوی سے تھی۔ اور اپنی محبوب اہلیہ کے نام پر اس مجموعۂ کلام کا نام رکھ کر انہوں نے مشرقی تہذیب کی ازدواجی روایات کو نمایاں کیا ہے۔ شاعر نے "میری شاعری" کے عنوان پر جس کسرِ نفسی سے اپنی شعری کاوشوں کا جائزہ پیش کیا وہ لائقِ مطالعہ ہے ہمیں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی یہ رائے نہایت برمحل نظر آتی ہے کہ زبان و بیان اور معنی و مفہوم میں سادگی کے باوجود انوؔر کا کلام اپنی فطری دلکشی اور جذباتی صداقت کی بدولت قارئین کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ ۱۶۸ صفحات کی اس کتاب پر قیمت درج نہیں ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی یکم جنوری ۶۵ء

بوٹم: رضا رام پوری (بھوپال)

شعری مجموعے: ہر دور میں شائع ہوتے رہے ہیں اور اُن کی پذیرائی بھی ہوئی ہے۔ لیکن ناموں کے لحاظ سے "شمع غزل" واردات قلب، اساس فکر، خیمہ گل، تلخیاں وغیرہ وغیرہ جسے نام ہی سامنے آتے رہے ہیں، مگر "بوٹم" جی ہاں یہ بھی ایک شعری مجموعے کا نام ہے۔ جس کے شاعر سیّد انور علی انور، موصوف نے اپنے شعری مجموعے کا نام "بوٹم" اپنی مرحومہ اہلیہ خورشید جہاں کے پیار کے نام "بوٹم" کی یاد میں رکھا ہے اور اپنی شریک حیات سے بے پناہ محبت کو مثال بنا دیا ہے۔ زندہ جاوید کر دیا ہے۔ شاعری ہر دور میں ایک خاص کیفیت، وجداں، یا واردات کی مرہونِ منت رہی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ درباروں سے وابستہ رہ کر باعث عزت وشہرت اور دولت بھی بن گئی اور یہ دولت بیش بہا انعام واکرام، جواہر جاگیر وخلعت تک محدود رہی، ہر دربار سے دو چار شاعروں کا وابستہ رہنا ضروری تھا لیکن فی زمانہ یا ۵ دہائیوں سے شاعری پیشہ بن بھی بن چکی ہے اور شاعروں سے بیشتر شعراء کو کثیر نذرانہ کی شکل میں رقمیں دیجاتی ہیں اور فلموں میں بھی شعری ضروریات نے مالی منفعت کے دروازے کھولدئے ہیں جبکہ "بوٹم" کا شاعر پیشہ ور شاعر نہیں بلکہ بطور پیشہ قانون داں ہے البتہ فن شعر گوئی اُسے وراثتاً ملا ہے۔ دادا "شائق" صاحب دیوان شاعر تھے والد "شوق" بھی مہر شعر گوئی .....اور انور علی انور جو خود کو شاعر کہتے ہوئے حجاب محسوس کرتے ہیں مگر کیفیات میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں تو مجسم شاعری کا پیکر بن جاتے ہیں۔ سید پبلیکیشنز کراچی وپاکستان سے شائع کردہ "بوٹم" ہندوستان میں بھی کثیر تعداد میں پہنچ چکی ہے کیونکہ انور صاحب کے کلام کو پسند کرنے والے پاکستان سے ادبی تحفے کے طور پر "بوٹم" بھی لاتے ہیں۔ پھر یہاں انور صاحب کے دوست احباب ہی نہیں رشتے دار بھی ہیں اور ہندوستان کی ایک عظیم شاعرانہ شخصیت جناب شفا گوالیاری (مرحوم) انور علی انور کے ہم زلف تھے۔ اس لئے یہ کتاب شریف شفائی سے مجھ تک بھی پہنچی اور اس طرح سے چند سطور لکھنے کی نوبت آئی۔ کیونکہ انور علی انور کے شعری مجموعے "بوٹم" میں سادگی پُرکاری اور محبت کے عقیدت کے پھولوں کی مہک ہے۔ یہ مجموعہ مجلّد بہترین کتابت، عمدہ طباعت اور نفیس کاغذ پر ہے۔ "بوٹم" کا پیش لفظ مولانا ماہر القادری (مرحوم) نے لکھا ہے اور ڈاکٹر محمد مسعود احمد، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر سید یاور عباس۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، پروفیسر الیف۔ ایم۔ شیخ، پروفیسر فیاض احمد کاوش اور حفیظ جالندھری جیسے ادبا کی رائے اور بہتر رائے بھی شامل ہے ساتھ ہی روزنامہ "جنگ" کا تجزیہ اور بہت سے دیگر دانشوروں کے اظہار خیال پر مبنی ہے۔ یہ مجموعہ حمد ونعت سے شروع ہو کر غزلوں اور چند قومی نظموں سے بھی آراستہ ہے غزلوں میں "انور" ہجر ووصال، لطف وکرم، اعتنا اور بے اعتنائی اور سراپا کشی کی روائتی اور قدیم صنف شاعری کے شاعر نظر آتے ہیں اور نظموں میں ملّت کے درد کو دل کی دھڑکنوں سموئے ہوئے، حساس اور دردمند نظر آتے ہیں۔ بحروں کے سلسلے میں انور نے صرف تین چار بحروں میں ہی طبع ازمائی کی ہے اور یہ کافی کیونکہ آج تو بہت سے شاعر صرف ایک ہی بحر یا زیادہ سے زیادہ دو بحروں میں ہی دیوان مکمل نہیں کرتے بلکہ عمر شاعری مکمل کر لیتے ہیں۔

انور بھی اپنے اشعار میں کہیں زمانہ کی ستم ظریفی پر جو بؤ نظر آتے ہیں کہیں درس عمل دیتے ہوئے تو کہیں ماتم گناں جیسے بن گئی کم ظرفی اخلاق جب معیار زیست کہہ نہیں سکتے کہ پھر انسان کیا بن جائیگا۔

یا یہ شعر: ہم کو دیکھا تو ہمارے ہو گئے

یہ تماشہ ہے بہت دیکھا ہوا

آجکل کی خودغرضانہ دوستی و نیابت کا غماز ہے۔ اسی طرح سادہ زبان میں غزل کے پیرایہ میں اپنی حسّاس فطرت کی جولانی کو یوں نمایاں کرتے ہے

آئے ٹھہرے چلدئے سمجھے کچھ نہیں

کس لئے زندہ رہے کیوں مر گئے

آج کے سئنٹفیک دور میں جہاں سائنس نے زندگی کو لاتعداد سہولیات بہم پہنچائی ھیں وہاں زندگی کو الجھنوں کا شکار بھی بنا دیا ہے اسی مضمون کو انور اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ارتقا انسانیت کا دیکھنا

زندگی انسان کی دوبھر ہو گئی

انور علی انور خود لکھتے ہیں کہ میں شاعری بلا ارادہ کر ہی نہیں سکتا۔ البتہ ایک خاص کیفیت جب بھی طاری ہوتی ہے شعر ہو جاتے ہیں اور اسی خیال کا اظہار شعر میں اس طرح کرتے ہیں۔

چشم ساقی ہیں مچلتی ہوئی صہبائے نشاط

دل کے پیمانے میں آئے تو غزل ہوتی ہے

زمانے کی بے ثباتی پر اس طرح اظہار خیال کرتے ھیں۔

نہ پوچھو کہ دھوکے میں ہم دوستی کے

عداوت کے کیا کیا نشاں دیکھتے ہیں

مجموعی طور پر سید انور علی انور غزل کی روائتی شاعری کے پیکر ہیں ان کا نہ کوئی مخصوص رنگ ہے اور نہ کسی پیرائے کے مقلّد نظر آتے ہیں۔ نہ ہی کسی کی چھاپ ان پر نظر آتی ہے بلکہ سیدھے اور سادہ الفاظ میں اپنی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں نظموں سے ہٹ کر غزلوں میں بھی بیشتر اشعار ملت کے درد اور دعوت عمل سے معمور ہیں۔

پیکرِ وفا کا حسن مجسم کہیں جسے
ایسا کہاں سے لائیں کہ بوٹم کہیں جسے

بُوٹم

مجموعۂ کلام
(اوّل)

سیّد انور علی انور

سیّد پبلیکیشنز
۲۰۶۔ لائنرز چیمبرز بندر روڈ کراچی

اشاعت اوّل ——— سنہ ۱۹۷۴ء

اشاعت دوم ——— سنہ ۱۹۸۰ء

تعداد اشاعت ——— ایک ہزار

ناشر ——— سیّد پبلیکیشنز، ۲۰۶/ لائرز چیمبر بندر روڈ کراچی

طابع ——— رشید اینڈ سنز پرنٹرز ناظم آباد ۲ کراچی

نوٹ ——— جملہ حقوق بحق سیّد انور علی انور محفوظ ہیں

"عطیۂ الٰہی" مانی گئی۔ میں اس "عطیۂ الٰہی" کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھ جیسے کمزور و ناتواں اور کم علم و بے عمل انسان پر بھی اس کی عنایات بے پایاں ہیں جن کا شکر ادا کرنا میری طاقت و قوت سے بالاتر ہے۔

اب بفضلہٖ تعالیٰ بوئے گُم کی اشاعتِ دوم پیش کی جا رہی ہے۔ پچھلی اشاعت کی فراخدلانہ پذیرائی کے پیشِ نظر موجودہ اشاعت کے لئے عمدہ کتابت و طباعت اور بہتر کاغذ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ غزلیات اور نظمیں (سوائے ایک دو غزلوں اور نظموں کے) وہی ہیں۔ البتہ نظموں کی ترتیب میں معمولی تبدیلی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تبصرے اور خطوط اصل کتاب سے پہلے دینے کے بجائے بعد میں دیئے گئے ہیں۔ تاکہ کتاب پڑھنے سے پہلے قاری کا ذہن متاثر نہ ہونے پائے اور وہ اپنی رائے خود قائم کر سکے۔

اشاعتِ اوّل کے بعد جن محترم بزرگوں اور دوستوں نے تبصرے اور خطوط عنایت کئے۔ ان میں جناب حفیظ جالندھری، جناب ممتاز حسن (مرحوم) جناب سید ہاشم رضا، جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، جناب پروفیسر ایف ایم شیخ، جناب پروفیسر فیاض احمد خاں کاوش، جناب سید نور محمد قادری، جناب محمد دنی خاں یوسف زئی ایڈووکیٹ اور جناب سید مکرم علی سیفی، فرید آبادی ایڈووکیٹ قابلِ ذکر ہیں میں ان تمام حضرات کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں۔

۱۱ نومبر ۱۹۷۹ء

۲۰۶۔ لائٹ ہاؤس چیمبر
بندر روڈ کراچی ۱؎

سیّد انور علی انور

دیباچہ طبع دوم

تحدیثِ نعمت

بوٹم کی اشاعتِ اوّل اس تذبذب کے عالم میں پیش کی گئی تھی کہ نہ معلوم یہ غزلیں اور نظمیں اہلِ ذوق حضرات کو پسند آئیں یا نہ آئیں۔ چنانچہ نہ تو عمدہ کتابت کا اہتمام کیا گیا اور نہ کاغذ ہی اچھا لیا گیا مگر جب کتاب چھپ کر قارئین تک پہنچی اور تبصرے اور خطوط موصول ہوئے تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ان بظاہر سیدھی سادی غزلوں اور نظموں کو بہت ہی زیادہ پسند کیا گیا۔ میرے ایک کرم فرما جناب سید نور محمد قادری صاحب نے تو یہاں تک لکھ بھیجا کہ "سید صاحب سخن گوئی کو ثانوی حیثیت نہ دیں۔ ممکن ہے کہ آپ کی دوسری تمام انگریزی اور اردو تصانیف دھری کی دھری رہ جائیں اور صرف اکیلی بوٹم ہی آپ کو حیاتِ جاودانی نصیب کرے۔"

ان تاثرات کو دیکھ کر جب اپنی صلاحیتوں پر نظر ڈالتا ہوں تو ایک عجیب کیفیت سامنے آتی ہے۔ ایک طرف بوٹم کی پذیرائی کا یہ عالم اور دوسری طرف میرا اپنا یہ حال کہ بالارادہ شعر کہنے سے قاصر۔ نتیجہ یہ کہ شاعر ہونے کے باوجود اپنے آپ کو شاعر نہیں کہہ سکتا۔

بہرحال بوٹم جس انداز میں بھی چھپی بقول محترمی ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب

ہونے والے زخموں کی ہر ٹیس حرف و بیان کی آغوش میں آکر خود بخود شعر کے قالب میں ڈھل جاتی ہے اور یہی میری شاعری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعری میرے لئے ایک غیر اختیاری اور ثانوی مشغلے کی حیثیت رکھتی ہے۔ میری اپنی پیشہ ورانہ اور نجی مصروفیتیں اس کی اجازت ہی نہیں دیتیں کہ شاعری کے لئے وقت نکال سکوں اور طبیعت کی افتاد بھی کچھ اس قسم کی ہے کہ شعر گوئی کی فکر میں پڑوں تو الجھن سی ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ شاعری میں غیر اختیاری کیفیت تک ہی اکتفا کرتا ہوں۔

برسوں کی جمع شدہ غزلیں اور نظمیں تعداد میں سو سوا سو تک پہنچ چکی ہیں۔ دوستوں کا اصرار ہے کہ ان کو شائع کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں میرے عزیز دوست جناب ونی خاں صاحب یوسف زئی ایڈوکیٹ کا نام قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اس مجموعے کی ترتیب اور تزئین میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ چنانچہ دوستوں کی خوشنودی اور خود اپنی جانب سے شعر و ادب کی ایک حقیر مگر فطری خدمت جان کر اپنی ان ادبی کاوشوں کو ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی چیز قابلِ قبول نہیں۔

آخر میں مولانا ماہر القادری، پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، اور ڈاکٹر سید یاور عباس صاحب کا بے حد ممنون ہوں۔ ان محترم حضرات نے اس مجموعۂ کلام کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے یہ محض ان کی عنایت ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ:-

ممنونِ التفاتِ نگاہِ جمال ہوں — مجھ کو نظر اٹھانے کے قابل بنا دیا

سید انور علی انور

یکم جون ۱۹۷۴ء

۲۰۶، لائنز چیمبر بندر روڈ کراچی

انتساب

عالمِ شباب کے ان حسین خوابوں کے نام جن کی تعبیر خورشید بن کر نمودار ہوئی اور ستّائیس سال تک میرے ظلمت کدۂ حیات کو منوّر کرنے کے بعد بالآخر ۱۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو ضیائے آفتاب کی مانند موت کے سیاہ بادلوں میں روپوش ہو گئی۔

یہ تھی خورشید بیگم میری شریکِ حیات سب جسے پیار سے بوٹم کہا کرتے تھے۔ اور واقعتاً صورت و سیرت میں وہ بوستانِ فطرت کا ایک لاجواب بوٹہ ہی تھی۔

آہ

دے سکے گا ساتھ اپنا تو نہ اک دو گام بھی
تجھ کو اے جانِ جہاں ایسا کہاں سمجھے تھے ہم

انور

دیباچہ طبع اوّل

میری شاعری

میں شاعر نہیں ہوں اس لئے کہ مجھے اپنی شاعری پر کوئی اختیار نہیں۔ شعر مجھ پر ایک کیفیت کے ساتھ وارد ہوتا ہے اور جب تک یہ کیفیت نہ ہو میرے لئے شعر کہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس کیفیت کا کوئی وقت اور کوئی مقام نہیں کسی وقت اور کسی جگہ بھی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور متعدد اشعار ایک تسلسل کے ساتھ سطحِ ذہن پر ابھر آتے ہیں اور میں انہیں موقع ملنے پر نقل کر لیتا ہوں۔ اس مجموعہ کی تمام غزلیں اور نظمیں اسی کیفیت کی مرہونِ منّت ہیں۔

جو کچھ میں نے عرض کیا یہ ایک حقیقت ہے۔ مجھے خود بھی اپنی اس کیفیت پر حیرت ہے آج تک شعر کا وزن اور بحر میری سمجھ میں نہیں آسکے کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ پوری کی پوری غزل بے وزن اور خارج از بحر ثابت ہوئی اور مجھے اس کا احساس تک نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ میں فرمائش یا خود اپنی ذاتی خواہش پر شعر کہنے سے قاصر ہوں۔ البتہ اس کیفیت کے پیدا ہونے کی دو وجوہات معلوم ہوتی ہیں۔ ایک وراثت اور دوسری وارداتِ قلب۔ جہاں تک وراثت کا تعلق ہے۔ میرے والد، دادا، پردادا ان تمام حضرات کو شعر گوئی کا شوق رہا ہے۔ دادا صاحب قبلہ میر سید علی شائق دہلوی مرحوم تو صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ جن کی کئی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ وارداتِ قلب کا تعلق اہلیہ مرحومہ کی محبت، ہجر و وصال اور انتقال کے واقعات سے ہے۔ ہزار مصروفیتوں کے باوجود جب بیتے ہوئے واقعات کے حسین یا غم انگیز یادوں کا سیلاب دل و دماغ کی گہرائیوں سے موجزن ہوتا ہے تو خوابیدہ جذبات کے اتھاہ سمندر سے اٹھنے والی ہر موج اور ہجر و فراق کے نامندمل